Āzād, Mohammad Hussain

نظمِ دلفروز
یعنی
مجموعۂ نظمِ آزاد

Nazm-i dilfuroz

از تصنیف شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد
سابق پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور
جس کو
مولوی سید ممتاز علی مالک رفاہ عام پریس لاہور نے مرتّب کیا
اور
دار الاشاعت پنجاب کی طرف سے

سنہ ۱۸۹۹ء

رفاہ عام سٹیم پریس لاہور میں چھپا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہرچند کہ ہندوستان میں نظمِ اُردو کا چراغ روشن کرنے والا شمس ولی اللہ دکنی تھا مگر جس شاعری کی اوّلیت کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا وہ عیش پسند عاشق مزاج اُمراء کا ایک کھلونا تھا جس کے ذریعے سے وہ ہجر یار کی مصیبتیں ہلکی کیا کرتے تھے اور فلکِ کجرفتار کی بیوفائیوں اور زمانے کی نیرنگیوں اور معشوق کے جور وجفا کا دُکھڑا روتے تھے۔ عاشقِ بیتاب کے دل کو قرار کہاں۔ کبھی وہ باغ میں دل بہلاتا ہے۔ کبھی صحرا کی خاک چھانتا ہے۔ کبھی مایوس ہوکر گورستان کی راہ لیتا ہے۔ مگر ہر حال میں صنم کی یاد کو دل میں جگہ دئے ہوئے ہے۔ وہ جنگل میں جاتا ہے تو وہاں کے نظارے کی تصویر کھینچتا ہے۔ مگر اس تصویر میں بھی عاشقانہ رنگ آمیزی ہے۔ سنبل زلفِ معشوق کی یاد دلاتی ہے۔ بنفشہ اس کی کاکل پیچاں ہے۔ پھول کی پنکھڑیاں ہوا سے سبزے پر نہیں گرتیں بلکہ قاصدِ صبا نے شاہدِ گُل کے کان میں کوئی بات کہی ہے جسے سُن کر وہ مارے ہنسی کے فرشِ سبزہ پر

لوٹ رہا ہے۔جب عاشق کسی ویرانے میں جاتا ہے تو تمام سُن سان جنگل اس کی حسرت ناک حالت کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے۔بید مجنوں رو رہا ہے۔شبنم کے آنسو جاری ہیں۔غرض گو ہمارے شعرا نے اپنی نظموں میں جذبۂ عشق کے سوا اَور مضامین بھی باندھے مگر وہ بھی اسی زمینِ عشق میں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظمِ اُردو زلفِ معشوق کے پیچوں میں ایسی اُلجھی کہ جو بات نظم کے ذریعے سے کہی جاتی ہے اس کے لئے ضرور ہے کہ وہ عشق کے شوخ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہو۔کسی کامیابی کا بیان کرنا ہو تو عروسِ مراد سے ہمکنار ہونا بیان کیا جاتا ہے۔کسی امر کی درازی بیان کرنی ہو تو شبِ ہجر یا زلفِ یار کی درازی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔اس شاعری کے خمیر میں عشق کی یہاں تک بھرمار ہوئی کہ پیغمبرِ خدا کو بھی صنم بنا دیا۔واللیل جس کی زلفیں ہیں۔اور والضحیٰ جس کا چہرہ ہے۔اور مازاغ کا سرمہ آنکھوں میں ہے۔پیغمبر تو پیغمبر اس شاعری نے اللہ تعالےٰ کو بھی ایک نازنین معشوقہ ٹھیرایا جو زنگاری دوپٹہ اوڑھے پردے میں بیٹھی ہیں۔اور اپنے دوستوں پر جفاکاریاں کر رہی ہیں ؛

نظم خلقتِ انسانی میں ایک نہایت موثر ملکہ ہے جس کا نشتر رگِ جان پر لگتا ہے۔اور جس کی کھٹک نقطۂ قلب پر پڑتی ہے۔انسان کے جذبات میں تلاطم پیدا کر دینا اور ایک چنگاری سے دلوں میں آگ بھڑکا دینا اسکا ادنےٰ کرشمہ ہے۔ایسی شریف و لطیف چیز کو شراب و میکدے میں ڈبو دینا کیسے افسوس کی بات ہے۔یہ شرف آزاد دہلوی ہی کی قسمت میں تھا کہ وہ اُردو شاعری کو ان پھندوں سے نکالیں اور جو اثر موثر حقیقی نے نظم میں رکھا ہے اس اثر کا

لطف اہل مذاق کو دکھلائیں۔ انہوں نے اپنی مثنوی شبِ قدر میں اپنی دلی حالت کی کیا سچی تصویر کھینچی ہے جبکہ وہ کہتے ہیں ؎

عالم ہے اپنے بسترِ راحت پہ خواب میں
آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں

پھیلائے ہاتھ صورتِ امیدوار ہے
اور کرتا صدق دل سے دعا بار بار ہے

مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض
رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض

یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

مجھ کو استاد آزاد کی خدمت میں بیس برس رہنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان کی مختلف حالتیں اور طبیعت کے اُتار چڑھاؤ دیکھے۔ میں نے ابتدا سے ان میں یہی دُھن پائی کہ وہ نظمِ اُردو کے دوسرے ولی بن جائیں۔ اور اس میں ایسا انقلاب پیدا کریں کہ یہ زبان بھی روئے زمین کی اَور معزز زبانوں کی طرح تمام مطالب علمی کے لئے کار آمد ہو سکے اور جس کے الفاظ اور بندشوں میں ہمارا دل اپنی پوری حسرتیں اور ارمان نکال سکے۔ اس منصوبے کا ظہور اگرچہ ۱۸۶۷ء میں ہوا لیکن یہ وہ منصوبہ تھا جس نے خاقانیِٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے دامنِ تربیت میں نشو و نما حاصل کیا تھا۔ جب آزاد دلی چھوڑ کر نکلے تو اس صورت سے نکلے کہ گھر باہر سب لُٹ کر برباد ہو چکا تھا۔ مگر یہ عزیز آرزو پہلو میں تھی۔ ۱۸۶۵ء میں کہ خطۂ پنجاب میں سر ڈانل میکلوڈ صاحب کا مبارک عہد تھا انہوں نے سریر آرائے سلطنت کی ہمدردی کا سہارا پایا۔ اور چند سخن شناسوں کے روبرو اس باب میں اپنے دلی خیالات ظاہر کئے۔

مگر اس سبب سے کہ اسی اثناء میں اُنھیں سفر بلخ و بخارا پیش آگیا یہ کوشش ادھوری اور ناکام رہی۔ سنہ ۱۸۶۷ء میں جبکہ وہ بہت سی سیر و سیاحت کر چکے تھے اور دُنیا کے تجربوں کے ذخیرے بھر چکے تھے اُنھوں نے اس آرزوے قدیمی کو جسے برسوں سے وہ سینے میں دبائے پھرتے تھے استقلال کے ساتھ ظاہر کرنا چاہا۔ چنانچہ ماہ اگست سنہ ۱۸۶۷ء میں آزاد نے ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ ہر چند کہ غزل کہنے سے طبیعت بیزار ہوگئی تھی۔ مگر اس پُرانی ڈگر کو چھوڑنا اور چُھڑوانا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا۔ طبیعت جو شاعرانہ جوش سے بھری پڑی تھی اس کو ضبط کرنا بھی مشکل تھا۔ ایک دفعہ احباب کے اصرار پر مشاعرہ میں یہ غزل پڑھی :-

غزل

ہم ان سے دور بظاہر ہزار بیٹھے ہیں / پہ لاکھ جان سے دل میں نثار بیٹھے ہیں
جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں / سوارِ خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں
جو سنگ در پہ ترے سایہ وار بیٹھے ہیں / وہ لات دولتِ دنیا پہ مار بیٹھے ہیں
ہے اُن کی خاک بھی چکّر میں گردباد کی طرح / جو انجمن میں تری ایک بار بیٹھے ہیں
ادھر بھی چشم عنایات ہو ذرا ساقی / کہ مست دیر سے امیدوار بیٹھے ہیں
چمن میں اُلجھے ہوئے ہیں جو دامنِ گل سے / وہ دل ہیں بُلبلِ شیدا کے خار بیٹھے ہیں
ترے شہید ہیں بے غسل و غش پڑے سوتے / کہ جو وبال تھا سر سے اُتار بیٹھے ہیں
جلا کے ہجر میں تم نے جو خاک کر دیا دل / ہم اس کا داغ لئے یادگار بیٹھے ہیں
کمالِ عشق تو یہ ہے کہ جو بظاہر حال / بگاڑ بیٹھے ہیں یاں وہ سنوار بیٹھے ہیں
نگاہِ ناز کا ساقی کے ایک ہے یہ کمال / کہ بزم ہوگئی مدہوش و یار بیٹھے ہیں

جو واں ہیں نرگسِ جادو تو دل کو ڈر کیا ہے — کہ یاں بھی زلف کا باندھے حصار بیٹھے ہیں
کمانِ ابروِ جاناں کے ایسے ہوں قرباں — کہ جتنے تیر ہیں سینے کے پار بیٹھے ہیں
وہ صاف ہوئینگے کیا اپنے خاکساروں سے — کہ آپ دل پہ یہ بن کر غبار بیٹھے ہیں
تمہاری زلف کو تھے باندھتے پریشاں ہم — سو دامن آج لئے تار تار بیٹھے ہیں
نظر اُٹھا کے نہیں دیکھتا وہ صید افگن — دلوں کو ہاتھوں پہ رکھے شکار بیٹھے ہیں
اُڑی جو خاک دلِ سوختہ کی وحشت میں — سمیٹے اس کا یہ مشتِ غبار بیٹھے ہیں
فلک کی فتنہ گری کیا ہے سیکڑوں ایسے — خرامِ یار سے اُٹھ کر غبار بیٹھے ہیں
گئے وہ غیر کے گھر اُٹھ کھڑے ہو حضرتِ دل — اب آپ کس کا کئے انتظار بیٹھے ہیں
عمامہ شیخ پہ چھوڑینگے کیا بھلا وہ رند — جو اپنی پگڑی کو پہلے اُتار بیٹھے ہیں

قمارِ عشق میں اب کیا لگائینگے آزاد
کہ نقدِ دل کو تو پہلے ہی ہار بیٹھے ہیں

پڑھنے کو یہ غزل تو پڑھ دی مگر پڑھ کر آزاد کا دل خوش نہ ہوا۔ اسکے بعد ہر چند کہ مشاعرہ ہوتا رہا مگر آزاد نے اپنی تمام تر توجہ ان خیالات کی اشاعت کی طرف لگائے رکھی جو زمانے کی شاعری کا رُخ بدلنے والے تھے۔ ان ایام میں آزاد نے نظم کے باب میں جو خیالات ظاہر کئے وہی اصل بنیاد تھی اس جدید شاعری کی جو ہندوستان میں سات سال بعد پیدا ہوئی۔ اس زمانے میں جو تقریریں آزاد نے تعلیم یافتہ لوگوں کی بھری مجالس میں کیں ان سے ان کے ارادے بخوبی ظاہر ہوتے ہیں۔ آخر اپریل ۱۸۶۷ء میں آزاد نے طلبہ اور تعلیم یافتہ اراکین لاہور کو مخاطب کر کے کہا کہ ”اے نونہالانِ گلشنِ تعلیم تمہارے باب میں میرے بہت

ارادے ہیں۔ مصلحتِ وقت یہ ہے کہ ایک دائرہ اپنے کاروبار کا ایسی جگہ کھینچو جو ان سے بہت علیحدہ ہو۔ اور اس کی فراخی کے لئے میدان توسیع کشادہ ہو۔ ان لوگوں کے حالات اَوْر تھے ویسے ہی خیالات اَوْر تھے۔ انہوں نے بہت کچھ زمانے کا دیکھ لیا۔ جو تمہارا وقت آج ہے اُن کا وہ وقت گذر گیا۔ تمہیں ابھی باغِ عالم میں پھلنا پھولنا ہے اور گرم وسرد روزگار دیکھنا ہے۔ کچھ کرو اور جو کچھ کرو سمجھ کر کرو۔ اور وہ کرو کہ تمہارا نام صفحہ ہستی پر یادگار رہے۔ ان جلیسوں کو تم بہ چشمِ کم نہ دیکھو کیونکہ یہ تو یقین ہے کہ بہر صورت جو کچھ حال آج ہمارے ملک کا ہے وہ نہیں رہیگا۔ اور آفتاب ترقی وتعلیم وتہذیب کا انشاءاللہ طلوع کریگا۔ اور بعد سالہائے سال کے ہم یا ہماری تمہاری اولاد جو اس دولت سے بہرہ ور ہونگے اور ان کاغذات اور ہمارے تمہارے حالات کو پڑھا کرینگے تو باہم تعجب کیا کرینگے اور کہا کرینگے کہ ایک وہ زمانہ تھا اور اہل زمانہ کا وہ عالم تھا کہ اس وقت میں بھی ایسے ایسے لوگ تھے جنہوں نے ان ان حالات سے اور ان ان خیالات سے سعی اور کوشش کی اور اب یہ صورت حال ہے اور یہ موقع وقت ہے۔

سچ ہے ؎

رستم رہا زمین پہ نہ سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

آخر آزاد کی دلی آرزو کب تک پردے میں نہاں رہتی ؎

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

جوش طبیعت نے جو کوہ آتش خیز کی طرح مدتوں سے رُک رہا تھا مئی سنہ ۱۸۷۴ء

میں رسمی بندشوں کو جھٹکے مار کر توڑ ڈالا اور انہوں نے بزم شعرا میں ایک نئے ڈھنگ کی مثنوی جس کا نام مثنوی شب قدر تھا سُنائی - سُننے والے بیان کرتے ہیں کہ جس وقت وہ مثنوی مجلس شعرا میں پڑھی گئی تمام مجلس پر ایک سناٹا اور سکوت کا عالم چھا گیا - یہ پہلا دن تھا جس روز ہمارے ملک کی نئی شاعری کی پہلی اینٹ رکھی گئی - آزاد کی سات سال کی شبا روزی محنت اور تقریروں نے مزاج میں تبدیلی پیدا کردی تھی اور ملکِ نظم کی آب وہوا بالکل بدل گئی تھی - شعرا کم وبیش انقلاب کے لئے تیار بیٹھے تھے اور نئی راہ پر آنے کے لئے ایک ادنےٰ سی تحریک کے منتظر تھے - آزاد کی طبعِ آتش بار کی ایک چنگاری کے نکلنے کی دیر تھی کہ ایوانِ شاعری میں چراغاں ہی چراغاں تھا - اگلے مشاعرے میں متعدد شعرا نے پُرانی شاعری کو خیرباد کہہ کر آزاد کی بتائی ہوئی راہ اختیار کی - اس نئی راہ کے راہ رووں نے چند دن ٹھوکریں کھائیں مگر پھر بھی پُرانی شاعری کی نسبت اس نے بہت جلد ترقی کی - پُرانی شاعری کے پہلے دَوْر کے شعرا کے کلام میں میر کے زمانے تک کوئی ترقی کا امتیاز نظر نہیں آتا - مگر جو روش شاعری کی آزاد نے نکالی اُس میں ترقی اس شتاب روی سے ہوئی کہ چند روز میں ہی آزاد کی موجودگی ہی میں حالی نے وہ دھوم دھام کی مثنویاں سُنائیں جو جدید شاعری کی جان ہیں - اور جو نہایت عزّت اور منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں - اور اپنی متانت اور دلفریبی میں آزاد کے کلام سے بڑھی ہوئی ہیں - تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نظم جدید میں حالی کی وہ بے نظیر کتاب نکلی جو جدید شاعری میں ہمیشہ یکتا سمجھی جائیگی - یہی نظم تھی جس نے مسلمانوں میں علی الخصوص ایک نئی تحریکِ اصلاحِ قوم کی پیدا کی - لیکن باایں‌ہمہ کسی چیز کو

کمال پر پہنچانے والے کیسی ہی عزّت و وقعت سے کیوں نہ دیکھے جائیں لیکن اصل یہ ہے کہ جب تک دنیا میں زبانِ اُردو بولی جائیگی آزاد کے نام کے آگے سخنورانِ اُردو کے سر بارِ احسان سے جُھکے رہینگے۔ اور زمانۂ حال کے ایوانِ سخنوری میں اوّلیّت کے لحاظ سے آزاد صدر نشین رہیگا۔ اور قبولیتِ عام اور شہرتِ خداداد تحسین و آفرین کے پھول اس کے سر پر برسائیگی ؀

مجھ خاکسار کی درخواست مولانا آزاد سے ہمیشہ یہ رہی کہ وہ اپنے بکھرے پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کر نوجوانان اہل طبع کی میز پر سجائیں مگر ملک اور اُردو زبان کی بدقسمتی کہ ہم ان کی زندگی ہی میں ان کی بے نظیر قابلیتوں سے محروم رہ گئے۔ وہ اپنی کلیات کو جمع نہ کرنے پائے تھے کہ ان کی طبیعت جادۂ اعتدال سے منحرف ہو گئی۔ میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں جو کچھ ان سے سُنا اشتیاق اور ادب کے دل سے اُسے محفوظ رکھا۔ جو اخباروں میں چھپا اُسے بھی یادگار استاد سمجھ کر گلے کا تعویذ بنایا۔ اب کہ ان کی صحت کی توقع بہت کم ہے اور میرا دل بالکل ٹوٹ گیا ہے میں اُن نوشتوں کو جنہیں بیس برس سے دل سے لگائے رہتا تھا چھاپ کر شائع کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ وہ شہرت کے پروں سے اُڑیں۔ ادب کی آنکھوں پر جگہ پائیں اور اشتیاق بھرے دلوں میں گھر کریں ؀

میں نے ان نظموں کی ترتیب میں ترتیبِ تصنیف کو ملحوظ رکھا ہے۔ مثنوی شبِ قدر سے لے کر مثنوی گنجِ قناعت تک جتنی مثنویاں ہیں وہ ۱۸۷۴ء میں کہی گئی تھیں۔ ان کے بعد کی نظمیں ۱۸۸۳ء کی ہیں مگر مبارکباد جشن جوبلی ۱۸۸۶ء کی ہے۔ ان نظموں میں علاوہ اُس غزل کے جو اوپر لکھی گئی تین اَور غزلیں ہیں

جن کا زمانہ تصنیف متعین نہیں ہو سکتا۔ مگر اتنا معلوم ہے کہ ان میں سے ایک غزل زمانہ جنون کی ہے۔ اس وقت تک میرے پاس جو سرمایہ تھا وہ احباب کی خدمت میں پیشکش کر دیا ہے۔ اگر مجھے ان کا کچھ اَور کلام ملا تو بشرطِ زندگی دوسری اشاعت میں شامل کرونگا ❖

مولانا آزاد نے بعض نظموں میں آخر زمانے میں کچھ اصلاحیں بھی کی تھیں مثلاً مثنوی شب قدر کے بعض نسخوں میں اس شعر کے بعد کہ ؎

	یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے	

یہ تین شعر بھی دیکھے گئے ہیں۔ ؎

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں کرجاتا صاف دشمن بدبیں پہ چوٹ ہے	کرتا ہے اسکو خرچ عدو کے علاج میں اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے

	کھوٹا اگر زبان کا ہے دل کا کھرا تو ہے اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے	

مگر میں نے جس طرح ان نظموں کو ان سے سُنا تھا اسی طرح یادداشتوں میں حوالہ قلم کیا اور اب اسی طرح چھاپا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ استاد آزاد کے کلام نے مجموعہ کی صورت اختیار کی۔ محرم ۱۳۱۷ھ ہجری میں یہ مجموعہ مرتب ہوا اور میں نے **نظمِ دلفروز** اس کا تاریخی نام رکھا۔ خدا کرے کہ یہ بزم معنی میں روشنی پھیلائے۔ اور رہروانِ طریقِ نظم کو نئی راہ دکھلائے ❖

راقم سید ممتاز علی

مقام لاہور۔ مورخہ ۳۰ جون ۱۸۹۹ء

تقریر جلسہ منعقدہ اگست ۱۸۶۷ء

خیالات نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں

فلاسفۂ یونان کا قول ہے کہ دنیا میں دو چیزیں نہایت عجیب و حیرت انگیز ہیں۔ اوّل نبضِ انسانی کہ بے گویائی حالِ باطن بیان کرتی ہے۔ دوّم شعر کہ انہیں الفاظ کے پس و پیش سے کلام میں موزونیّت اور اُس سے ایک تاثیر عجیب دل پر پیدا ہوتی ہے۔ کتابوں میں اکثر شعر کے معنی کلامِ موزوں و مقفےٰ لکھے ہیں۔ لیکن درحقیقت چاہیئے کہ وہ کلام مؤثر بھی ہو ایسا کہ مضمون اُس کا سُننے والے کے دل پر اثر کرے۔ اگر کوئی کلام منظوم تو ہو لیکن اثر سے خالی ہو تو وہ ایک ایسا کھانا ہے کہ جس میں کوئی مزا نہیں۔ نہ کھٹّا نہ میٹھا۔ جیسا کہ شعر کسی استاد کا ہے ؎

دندان تو جملہ در دہانند		چشمان تو زیر ابروانند	

جب انسان کے دل میں قوّتِ گویائی اور جوشِشِ مضمون مجتمع ہوتے ہیں تو طبیعت سے خود بخود کلام موزوں پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر ایسی قوت اور اُس قوت کا جوش و خروش زیادہ ہوگا اُسی قدر کلام پُر تاثیر ہوگا۔ روے زمین پر پہلا غم ہابیل کا تھا کہ قابیل کے سبب سے حضرت آدم کے دل پر طاری ہوا اُسے نتیجہ جوشِ غم کا سمجھنا چاہیئے کہ باوجودیکہ اُس وقت تک شعر و شاعری کا نام نہ تھا مگر جوشِ طبیعت سے جو کچھ کلام اُس وقت اُن کی زبان سے نکلا موزوں تھا چنانچہ وہ سُریانی میں اب تک موجود ہے۔ جبکہ اصل کلام موزوں کی حضرت آدم سے ہوئی تو فرزند رشید وُہی موزوں طبع ہے کہ جو باپ کے میراث

سے بہرہ ور ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ آدمی اور حیوان میں فرق گویائی کا ہے پس قوت انسانی بھی اُسی میں کامل سمجھنی چاہئے جس میں قوت گویائی کامل ہو۔ چونکہ نظم بہ نسبت نثر کے زیادہ تر زور طبیعت سے نکلتی ہے یہی سبب ہے کہ بہ نسبت نثر کے مؤثر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی مضمون کوئی مطلب کوئی خیال جو انسان کے دل میں آئے یا مخاطب کو سمجھانا چاہے تو تکلم سے نقش مدعا کو رنگ تقریر میں لاتا ہے تاکہ ظاہر ہو پس شاعر گویا ایک مصوّر ہے۔ لیکن نہ وہ مصوّر کہ خر و اشتر۔ درخت و پتھر کی تصویر کاغذ پر کھینچے۔ بلکہ وہ ایسا مصوّر ہے کہ معنی کی تصویر صفحہ دل پر کھینچتا ہے اور بسا اوقات اپنی رنگینی فصاحت سے عکس نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبائش دیتا ہے۔ وہ اشیاء جن کی تصویر قلم مصوّر سے نہ کھنچے یہ زبان سے کھینچ دیتا ہے۔ چنانچہ ہزاروں صفحہ کاغذ بھیگ کر فنا ہو گئے مگر صدہا سال سے آج تک اُن کی تصویریں ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ کبھی تصویر غم صفحۂ دل پر کھینچتا ہے۔ کبھی مضامین فرحت و عیش سے طبیعت کو گلزار کرتا ہے۔ انتہا مرتبہ ہے کہ جب چاہتا ہے ہنسا دیتا ہے جب چاہتا ہے رُلا دیتا ہے۔ اہل عرب معرکہ ہائے قتل میں رجز خوانی کرتے تھے۔ سلاطین ہند کے ہاں صفِ جنگ میں سُور۔ وِیر۔ راوت۔ بھاٹ وہ وہ کڑکے کوت کہتے تھے کہ لوگ جانیں اپنی موت کے مُنہ میں جھونک دیتے تھے۔ اور اب تک یہ عالم ہے کہ جب سُنے جاتے ہیں بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سکندرِ اعظم کتاب ہومر کو دیکھتا تھا اور سوتے میں بھی جدا نہ کرتا تھا۔ شاعر اگر چاہے تو امورات عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے۔ پتھر کو گویا کر دے۔ درختانِ یا درگِل کو رواں کر دے۔ ماضی کو حال۔ حال کو استقبال کر دے۔ دور کو نزدیک کر دے۔ زمین کو آسمان۔

خاک کو طلا۔ اندھیرے کو اُجالا کر دے۔ اگر غور کر کے دیکھو تو اکسیر اور پارس اسی کو کہنا چاہیئے کہ جسے چھو جائے سونا ہو جائے۔ زمین اور آسمان اور دونوں جہان شعر کے دو مصرعوں میں ہے ترازو اُس کی شاعر کے ہاتھ میں ہے جدھر چاہے جُھکا دے*

نظم درحقیقت ایک شاخ گلریز فصاحت کی ہے جس طرح پھولوں کے رنگ و بو سے دماغ جسمانی تر و تازہ ہوتا ہے۔ شعر سے روح تر و تازہ ہوتی ہے۔ پھولوں کی بو سے مختلف خوشبوئیاں محسوسِ دماغ ہوتی ہیں۔ کسی کی بو تیز ہے۔ کسی کی بو مست ہے۔ کسی بو میں نفاست و لطافت ہے۔ کسی میں سُہانا پن۔ اسی طرح مضامین اشعار کا بھی حال ہے جس طرح پھول کہ کبھی چمن میں۔ کبھی ہار میں۔ کبھی عطر کھینچ کر۔ کبھی عرق میں جا کر۔ کبھی دور سے۔ کبھی پاس سے مختلف کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مضامین شعری مختلف حالتوں اور مختلف عبارتوں میں رنگا رنگ کی کیفیتیں عیاں کرتے ہیں*

عالمِ جسمانی میں انسان کے لئے غذا مادۂ حیات ہے اسی طرح عالمِ معنی میں روح کے لئے غذا درکار ہے۔ چونکہ اشعار و مضامینِ لطیف سے روح قوتِ کمال اور طاقتِ بلند پروازی پاتی ہے۔ یہی اُس کی غذا ہے۔ روح کی لطافت و نفاست تو خود ظاہر ہے کہ وہ خاص روح القدس کے آفتابِ قدرت کا پرتوہ ہے اسی سے شعر کے جوہرِ لطافت کو خیال کرنا چاہیئے کہ نفاست میں کس مرتبۂ عالی پر ہوگا۔ شاعر کو ایک نسبتِ خاص عالم بالا سے ہے کہ بے وساطت اور بے اسباب ظاہری کے اُدھر سے اپنا سلسلہ جاری کرتا ہے۔ فی الحقیقت شعر ایک پرتوہ روح القدس

کا اور فیضان رحمتِ الٰہی کا ہے کہ اہلِ دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ظاہرا اپنے کلبۂ احزان میں پڑا رہتا ہے مگر تمام عالم میں اس طرح پر حکومت کرتا ہے جیسے کوئی صاحبِ خانہ اپنے گھر میں پھرتا ہے۔ پانی میں مچھلی اور آگ میں سمندر ہو جاتا ہے۔ ہوا میں طائر بلکہ آسمان پر فرشتہ کی طرح نکل جاتا ہے۔ جہاں کے مضامین چاہتا ہے بے تکلف لیتا ہے اور بہ تصرف مالکانہ اپنے کام میں لاتا ہے۔ زہے سعادت اُس کی جسے ایسے ملک معنی کی سلطنت نصیب ہو۔ شعر گلزارِ فصاحت کا پھول ہے۔ گلہائے الفاظ کی خوشبو ہے۔ روشنیٔ عبارت کا پرتوہ ہے۔ علم کا عطر ہے۔ قوائے روحانی کا جوہر۔ تاثیر معنوی کا سَتْ ہے۔ روح کے لئے آبِ حیات ہے۔ گردِ غم کو دل سے دھوتا ہے۔ طبیعت کو پھیلاتا ہے۔ خیال کو عروج دیتا ہے دل کو استغنا اور بے نیازی۔ ذہن کو قوتِ پرواز دیتا ہے۔ گرد افکار سے دامنِ دل کو بلند رکھتا ہے۔ تنہائی میں دل لگی پیدا کرتا ہے۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت۔ سفر در وطن اور سیر در چمن کے یہی معنی ہیں۔ اگرچہ شاعر ہمیشہ فکر و تردّد میں غرق رہتا ہے لیکن ایک شعر کہہ کر جیسی اُس کے دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے بادشاہ کو تسخیر ہفت کشور سے نہیں ہوتی۔ دل میں سوز و گداز اور طبیعت میں ایسی قبولیت اثر کی پیدا کرتا ہے کہ بات بات میں ایک لطف اور کیفیت حاصل ہوتی ہے اور وہ لطف طاقتِ تحریر و تقریر دونوں سے باہر ہے۔ اس کے اثر سے جو رنج دل پر طاری ہوتا ہے صاحبِ درد ہی اُسے خوب جانتا ہے کہ ہزار خوشیوں سے زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ فضیلت اختیاری نہیں۔ یعنی موزونیٔ طبع جوہر خداداد ہے اور اس نعمت کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے،

رباعی	سرمد غمِ عشق بوالہوس را ندہند عمرے باید کہ یار آید بہ کنار		سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند	

جنون بھی ایک طرح سے لازمۂ شاعری ہے۔[۵۱] بعضے محققوں کا قول ہے کہ دیوانہ اور عاشق اور شاعر کے خیالات بعض بعض مقامات پر متحد ہو جاتے ہیں۔ شاعر کو لازم ہے کہ سب طرف سے مطمئن اور سب خیالات سے منقطع ہو کر اسی کام میں متوجہ اور غرق ہو جائے اور یہ بات سوائے مجنون کے یا عاشق کے کہ وہ برادر مجازی اُس کا ہے ہر ایک شخص سے نہیں ہو سکتی۔ مجنون کو اپنے جنون اور عاشق کو معشوق کے سوا دوسرے سے کچھ غرض نہیں۔ خدا یہ نعمت سب کو نصیب کرے[۵۲]۔

اکثر لوگ ایسے ہیں کہ جسمانی محنت سے مر کھپ کر انھوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ مگر لطف شعر سے بہرہ نہیں۔ اگر تمام عمر ضائع کریں ایک مصرع پُر درد اُن کی زبان سے نہ نکلے اُن کا ذکر بھی انشاء اللہ اس سلسلے میں آئیگا۔

بعضے ایسے ہیں کہ اُن سے کلام موزوں پڑھا بھی نہیں جاتا بلکہ انہیں موزوں و ناموزوں میں فرق بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ غضب الٰہی ہے۔ خدا اس سے محفوظ رکھے۔ بعضے شاعر مضمون خوب نکالتے ہیں مگر زبان صاف نہیں کہ بیان بفصاحت کر سکیں۔ بعضے ایسے ہیں کہ زبان اُن کی صاف ہے مگر مضامین عالی نہیں۔ چنانچہ

---

۵۱ اس خیال کو مولانا آزاد نے مجھ پر بارہا ظاہر کیا۔ وہ اکثر مجھے شعرا کے ایسے قصے سُنایا کرتے جن سے ان شعرا کے مزاجوں کی مجنونانہ کیفیتیں معلوم ہوں۔ اپنی نسبت مولانا آزاد نے بارہا یہ کہا کہ میں اپنے خیالات میں کسی وقت ایسا محو ہوتا ہوں کہ جائے ضرور میں جا کر بجائے کمر بند کے انگرکھے کے بند کھولنے لگتا ہوں۔ سید ممتاز علی

۵۲ افسوس کہ یہ دعا بد دعا کرنے والے کے حق میں قبول ہو گئی۔

ہر ایک کی جگہ پر بجائے خود اشارہ کیا جائیگا۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جوش مضامین اور شگفتگی طبع کے لئے بعض بعض موسم خاص ہیں چنانچہ فصل بہار اور موسم برسات میں طبائع موزوں زیادہ تر شگفتہ ہوتے ہیں بلکہ ناموزوں اور مردہ دلوں کی طبیعت میں بھی ایک حرکت مذبوحی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے لئے اوقات اور مقامات خاص ہیں۔ اوّل خلوت کہ جہاں ذہن اور طبیعت نہ بٹے خواہ گھر میں گوشۂ عافیت ہو خواہ باغ خواہ صحرا خواہ کنارِ دریا۔ اور دل ہمہ تن اُسی میں مصروف ہو ✤

اکثر وقت شب کہ جب خلقِ خدا اپنے اپنے کاموں سے تھک کر سو جاتی ہے تب شاعر اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ جب تمام عالم سُن سان ہو جاتا ہے تب اُس کی طبیعت میں شور پیدا ہوتا ہے۔ جوں جوں رات ڈھلتی جاتی ہے خیال زیادہ تر بلند ہوتا ہے اور مضمون پَیْرتا جاتا ہے۔ خصوصاً پچھلی رات اور قریب صبح کہ عالم چپ چاپ اور خاطر مطمئن۔ طبیعت صاف۔ ہوا لطیف ہوتی ہے۔ دل شگفتہ ہوتا ہے۔ مضمون کی کاوش سے دل کو ایک لذّت حاصل ہوتی ہے۔ مضامین عالی طبیعت سے اور الفاظِ پُر معانی زبان سے متراوش ہوتے ہیں ✤

شاعر کو چاہئے کہ طبیعت اُس کی زیادہ تر قابل اور متاثر ہو مثل آبِ رواں کہ جو رنگ اُس میں پڑ جاتا ہے وہی اُس کا رنگ ہو جاتا ہے اور جس چیز پر پڑے ویسا ہی رنگ دیتا ہے مائل کی رباعی اس مقام پر مجھے یاد آئی ؎

کعبہ میں بھی ہمنے اُسے جلتے دیکھا	اور دیر میں ناقوس بجاتے دیکھا
شامل ہے بہ ہفتاد و دو ملت مائل	ہر رنگ میں پانی سا سماتے دیکھا

اُس کی اپنی ہی طبیعت کا اثر ہوتا ہے کہ جو مضمون فرحت - یا غم - رزم یا بزم کا باندھتا ہے جتنی اُس کی طبیعت اُس سے متاثر ہوتی ہے اُتنا ہی اثر سُننے والے کے دل پر ہوتا ہے - دنیا میں بعضے لوگ ایسے ہیں کہ جب وہ شعر سُنتے ہیں تو دل بے قرار اور طبیعت بے اختیار ہو جاتی ہے - سبب اس کا یہ ہے کہ ان کا دل مثلِ آئینہ صاف اور طبیعت اثر پذیر ہے - اور بعضے ایسے ہیں کہ اُن کے سامنے اگر طلسماتِ معنی کے دریا کو شیشہ میں بند کر کے رکھ دو تو بھی انہیں خبر نہ ہو - سبب اس کا کدورتِ دل ہے کہ نورِ معنی اُس میں اثر نہیں کر سکتا - روشن دلانِ اہلِ درد کے نزدیک طلوع و غروب آفتاب اور انقلاب صبح و شام ہزاروں باغ نو بہار قدرتِ الٰہی کے شگفتہ کرتا ہے اور تیرہ دلانِ بے خبر کے نزدیک کارگاہِ عالم ایک خراس یا دولاب ہے کہ دن رات چکر میں چلا جاتا ہے ؀

علم موسیقی کا لطف اور گلزارِ بوقلموں کی کیفیت ظاہر ہے کہ بیان سے باہر ہے لیکن جو لوگ بینائی سے محروم یا کانوں سے معذور ہیں وہ بیچارے اُن کے لطفوں سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے - اسی طرح جو لوگ لطفِ طبیعت اور صفائی دل سے محروم ہیں وہ کیفیتِ شعر و فصاحتِ کلام سے محروم ہیں - اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ بعضی طبائع شعر سے متنفر پائی جاتی ہیں اور دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں - اگر فائدہ سے یہی مُراد ہے کہ جس کے عمل سے چار پیسے ہاتھ میں آجائیں تو بیشک شعر بالکل کارِ بیفائدہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ ابنائے زمانہ نے آجکل شعر کو ایک ایسی ہی حالت میں ڈال دیا ہے لیکن باوجود اس کے بھی جو لوگ طبعِ موزوں رکھتے ہیں اگر زورِ طبیعت کو علوم اور تواریخ و قصص میں صرف کریں تو فائدہ

وکسب دنیاوی بھی خاطر خواہ دیوے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العموم فنِ شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے۔ لیکن جو لوگ سرِ معنی اور اصل سخن کو پہنچے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر صنّاع خبثِ طبیعت سے صنعت کو بُری طرح کام میں لائے تو اصل صنعت پر الزام نہیں آسکتا۔ شیطان نے معلم الملکوت ہو کر گمراہی اختیار کی پس اس کے لئے ہرگز علم کو ضلالت نہیں کہہ سکتے۔ مسائل فلسفہ و حکمت جن سے اہلِ ہدایت ثبوت ذاتِ باری اور تصدیق وحدت الٰہی کرتے ہیں اُسی سے اہلِ ضلالت دہر و الحاد پر استدلال کرتے ہیں۔ پس جس طرح سے اُن کی ضلالت سے فلسفہ و حکمت پر الزام نہیں آسکتا اسی طرح شاعروں کی بدزبانی و بدخیالی سے شعر بھی تہمتِ کفر سے بدنام نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت ایسے کلام کو شعر کہنا ہی نہیں چاہئے کیونکہ شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش خروش خیالاتِ سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے اور اُسی قوتِ قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلۂ خاص ہے۔ خیالات پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں مرتبۂ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں ❊

ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے متبحر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی اور اُن تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین و آسمان کا ہے۔ البتہ فصاحت اور بلاغت اب زیادہ ہے مگر خیالات خراب ہو گئے۔ سبب اس کا سلاطین و حکام عصر کی قباحت ہے اُنہوں نے جن جن چیزوں کی قدردانی کی لوگ اس میں ترقی کرتے گئے ورنہ اسی نظم شعر میں شعرائے اہل کمال نے بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں جن کی بنا فقط پند و اندرز پر ہے اور اُن سے ہدایت ظاہر و باطن کی حاصل ہوتی ہے چنانچہ بعض کلام سعدی و مولوی روم و حکیم

ثنائیؔ و ناصر خسرو اسی قبیل سے ہیں۔ امید ہے کہ جہاں اور محاسن و قبائح کی ترویج و اصلاح پر نظر ہو گی فن شعر کی اس قباحت پر بھی نظر رہے گو آج نہیں مگر امید قوی ہے کہ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرہ نیک حاصل ہو۔ آزادؔ

تمہاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھیگا ۔۔۔ نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے۔ کبھی تو دیکھیگا

اُردو زبان کی نظم و انشا پردازی

اے حاضرینِ باتمکین! آج میں ایک ایسے امر پر کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں جس میں دخل دینا میری حد سے باہر ہے۔ کیونکہ وہ حقیقت میں اُس ملکِ وسیع کی زبان سے متعلق ہے جسے اہل عالم مملکتِ ہندوستان کہتے ہیں۔ اُس کا حال ایسا ہو رہا ہے کہ حب الوطنی کسی طرح خاموش نہیں رہنے دیتی۔ امر مذکور کیا ہے؟ نظم اور انشا پردازی اُردو زبان کی ہے۔ جو کہ ہمارے ہر قسم کے ادائے مطلب۔ اور عام تصنیفات۔ اور تفریح طبع کا ذریعہ ہے۔ اس وقت یہ موقع نہیں۔ کہ زبان ہند کی تحقیق میں کاوش کر کے پُرانی بنیادیں نکالی جائیں۔ اس لئے یہی کہنا کافی ہے کہ زبان موجودہ ہماری یعنی اُردو زبان حقیقت میں ہندوستان کی برج بھاشا ہے جس میں فارس کے مسافر نے آکر عمل دخل کیا۔ اور صاحب خانہ نے اِس بِن بُلائے مہمان کو اپنے وسعت اخلاق سے اُسے خاطر خواہ جگہ دے دی ؂

سب جانتے ہیں کہ خود برج بھاشا اپنے عہد میں عام زبان تھی۔ مگر دربار و اور علموں پر ماں کا قبضہ تھا یعنی سنسکرت کہ جس کی گود میں فصاحت و بلاغت کے

دریا لوٹتے تھے۔ اور برج بھاشا وہ زبان تھی جو کہ گھروں میں کام کاج کی باتوں اور بازاروں میں سودے سُلف کے لین دین سے خاص و عام کی ضرورتیں پوری کرتی تھی۔ چونکہ بھاشا علمی اور تصنیفی زبان نہ تھی۔ اس واسطے اس میں استعارہ اور تشبیہ سے انشا پردازی کی باریکیاں اُس اعلیٰ درجے پر نہ پہنچیں جو سنسکرت میں ہیں۔ پھر بھی وہ ہر ایک موقع پر اس خوبی اور خوش اسلوبی سے اپنا مطلب پورا پورا ادا کرتی تھی۔ جس کی کیفیت کو جاننے والے ہی جانتے ہیں ✤

جب بھاشا سے اُردو پیدا ہوئی تو کئی سو برس تک اُس میں باتیں ہی باتیں رہیں۔ یعنی تحریر اور تصنیف تک نوبت نہ پہنچی۔ لیکن جس طرح کوئی زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح کوئی زبان بے نظم کے نہیں رہ سکتی چنانچہ پریشاں شعر تو کئی سو برس سے اُردو میں چلے آتے تھے۔ جب شاہ جہاں کے بعد زبان موجودہ کی عمر سو برس کی ہوئی تو ولی شاعر پیدا ہوئے۔ اور ساتھ ہی جا بجا دیوان ترتیب ہونے لگے ✤

اُردو کی مالک اُن لوگوں کی اولاد تھی۔ جو اصل میں فارسی زبان رکھتے تھے اسی واسطے اُنھوں نے تمام فارسی بحریں اور فارسی کے دلچسپ اور رنگین خیالات اور اقسام انشا پردازی کا فوٹو گراف فارسی سے اُردو میں اُتار لیا۔ تعجب یہ ہے کہ اس نے اس قدر خوش ادائی اور خوشنمائی پیدا کی کہ ہندی بھاشا کے خیالات جو خاص اس ملک کے حالات کے بموجب تھے اُنھیں بھی مٹا دیا۔ چنانچہ خاص و عام پپیہے اور کوئل کی آواز اور چنپا چنبیلی کی خوشبو کو بھول گئے۔ ہزار و بلبل اور نسترن و سنبل جو کبھی دیکھی بھی نہ تھیں اُن کی تعریفیں کرنے لگے۔ رستم و اسفندیار کی

بہادری۔ کوہ الوند اور بے ستون کی بلندی ۔ جیحوں ۔ سیحوں کی روانی نے یہ طوفان اُٹھایا کہ ارجن کی بہادری ۔ ہمالہ کی ہری ہری پہاڑیاں برف سے بھری چوٹیاں اور گنگا جمنا کی روانی کو بالکل روک دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ایک اعتبار سے ہمیں فارسی زبان کا ممنون احسان ہونا چاہئے کہ اس کی بدولت ہمارے کلام میں بلند پروازی اور جوش خروش کا زور پیدا ہو گیا۔ اس کے استعارہ اور تشبیہوں سے بہت سے نازک اور لطیف خیالات کے ظاہر کرنے کی قوت ہو گئی۔ لیکن چونکہ یہ خیالات فارسی کی نظم و نثر سے آئے ہیں جہاں کے چمن میں باریک باریک استعاروں کی نسیم خوشبو پھیلاتی ہے۔ اور لطیف لطیف تشبیہوں کی شبنم شاداب کرتی ہے۔ اس لئے انہیں پھولوں کا عطر اس زبان میں آیا۔ بیشک اُن کی بلند پروازی اور نازک خیالی جس درجے پر ہے اس کی حد نہیں۔ لیکن اصل مطلب کو ڈھونڈو تو باریکی اور تاریکئِ الفاظ اور استعاروں کے اندھیرے میں ایک جگنو ہے کہ کبھی چمکا اور کبھی غائب۔

اے گلشنِ فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغہ اور بلند پروازیوں کے بازوؤں سے اُڑے۔ قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے۔ لفاظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے۔ اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم۔ کسی شے پر رغبت یا اُس سے نفرت۔ کسی شے سے خوف یا خطر۔ کسی پر قہر یا غضب۔ غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو اُس کے بیان سے وہی اثر۔ وہی جذبہ۔ وہی جوش سُننے والوں کے دلوں پر چھا جائے۔ جو اصل کے مشاہدہ سے ہوتا۔ بیشک مبالغہ کا زور

تشبیہ اور استعارہ کا نمک۔ زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہئے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک۔ تشبیہ اور استعارہ ہمارے مطلب میں ایسے ہونے چاہئیں۔ جیسے کسی معرکہ یا دربار یا باغ کی تصویر پر آئینہ۔ کہ اُس کی کیفیت کو زیادہ روشن کرے۔ نہ اتنے آئینے کہ تصویر کا اصلی حال ہی نہ دکھائی دے۔ تب اس موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ہمیں چاہئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں۔ لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانہ کا کچھ اَور ہے۔ ذرہ آنکھیں کھولینگے۔ تو دیکھینگے۔ کہ فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھُلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے۔ طرح طرح کے ہاتھوں میں لئے حاضر ہیں۔ اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی مُنہ دیکھ رہی ہے۔ لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو۔ جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے ؂

اے میرے اہل وطن! اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری نظم کو سامانِ آرایش سے مفلس کہتا ہوں۔ نہیں۔ اُس نے اپنے بزرگوں سے لمبے لمبے خلعت اور بھاری بھاری زیور میراث پائے مگر کیا کرے کہ خلعت پُرانے ہو گئے۔ اور زیوروں کو وقت نے بے رواج کر دیا۔ تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے۔ مگر نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں۔ وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں۔ اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہموطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔ اب مجھے دوسری طرف متوجہ ہونا واجب ہے یعنی اے انگریزی کے سرمایہ دارو! تم اپنے ملک کی نظم کو ایسی حالت میں دیکھتے ہو۔ اور

تمہیں افسوس نہیں آتا - تمہارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتی ہے - اور تمہیں اس کا درد نہیں آتا - اپنے خزانے اور اپنے توشہ خانے سے ایسا بندوبست نہیں کرتے کہ جس سے وہ اپنی حیثیت درست کر کے کسی دربار میں جانے کے قابل ہو - یہ وطن کا فرض ہے کہ قرض سے زیادہ اُس کا ادا کرنا واجب ہے ؎

بھاشا پر جو فارسی نے اثر کیا اور اُس سے نظم اور انشاے اُردو نے ایک خاص لطافت حاصل کی - وہ اُن لوگوں کی بدولت ہوئی کہ بھاشا اور فارسی دونوں سے واقف تھے - تم خیال کرو کہ جو اُس وقت بھاشا اور فارسی کا حال تھا آج بعینہٖ اُردو انگریزی کا حال ہے - پس اس کی نظم میں اگر انگریزی کے خیالات کا پرتوہ حاصل ہوگا - تو اُنہی لوگوں کی بدولت ہوگا جو دونوں زبانوں سے واقف ہونگے اور سمجھینگے کہ انگریزی کے کون سے لطائف اور خیالات ایسے ہیں جو اُردو کے لئے زیور زیبائش ہو سکتے ہیں ؎

اے میرے اہل وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے - کہ عبارت کا زور - مضمون کا جوش و خروش - اور لطائف و صنائع کے سامان - تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں - کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں - کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں - وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں جس میں کچھ وصل کا لطف - بہت سے حسرت و ارمان - اُس سے زیادہ ہجر کا رونا - شراب - ساقی - بہار - خزاں - فلک کی شکایت اور اقبال مندوں کی خوشامد ہے - یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں - اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دور دور کے استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی - وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں - اور فخر کی موچھوں پر

تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں سے ذرہ بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اُٹھا سکتے۔ یعنی اگر کوئی واقعی سرگذشت۔ یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہو جاتے ہیں ؎

پس ہمیں اس سے زیادہ کیا افسوس ہوگا۔ کہ ہم اپنے زوروں کو بے اصل اور معدوم باتوں میں ضائع کرتے ہیں۔ اور جواہر کے خزانے کام کی جگہ نہیں لگا سکتے بے جگہ لٹاتے ہیں۔ کیسی حسرت آتی ہے۔ جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین کو نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈالتے ہیں۔ اور مضمون کی جان پر احسان کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں کیا؟ سُن کر ترسیں۔ اپنے تئیں دیکھ کر شرمائیں۔ کاش ہم جو ٹوٹی پھوٹی نثر لکھتے ہیں۔ اُتنی ہی قدرت نظم پر بھی ہو جاوے۔ جس کے اعلیٰ درجے کے نمونے انگریزی میں موجود ہیں۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں۔ ہمارے بزرگ ردیف و قافیہ کے ساتھ ایسی دلپسند بحریں اور نازک خیالیوں کے سامان ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں کہ اگر ہمت کریں تو کسی سے پیچھے نہ رہیں ؎

اے میرے اہلِ وطن! ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہیگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بسبب بے قدری کے اَور کہنے والے پیدا نہ ہونگے۔ کئی پُرانی مورتیں باقی ہیں۔ وہ چراغ سحری ہیں۔ انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہوگی۔ اور اُردو میں نظم کا چراغ گل ہوگا۔ میرے اہلِ وطن! آؤ آؤ برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اُٹھو اُٹھو وطن اور اہلِ وطن کی قدیمی ناموری کو بربادی سے بچاؤ۔ تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرنے میں

کوشش کرو نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائیگی۔ کہ اُن کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہو گی۔ اور اِس فخر آبائی۔ اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا بڑے افسوس کا مقام ہے ؂

اس میں کُچھ شک نہیں کہ درست یہ کام کُچھ مشکل ہے۔ کیونکہ ان محدود احاطوں میں جو کچھ موجود ہے۔ وہ ڈیڑھ سو برس سے آج تک بڑے بڑے سحر البیان فصیحوں نے شام کو صبح اور صبح کو شام کرکے پیدا کیا ہے۔ دلوں کے خون اور دماغوں کے روغن پسینے کرکے بہائے ہیں۔ جب یہ دلپسند خیالات۔ شُستہ الفاظ۔ پاکیزہ ترکیبیں خوشنما تراشیں۔ مضمون کی گرمیاں۔ انداز کی شوخیاں پیدا ہوئی ہیں۔ کہ سُننے والوں کے کانوں میں رس ڈالتی ہیں۔ اگر کوئی موزوں طبع چاہے کہ عام چیزیں جو آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اُن میں سے جس کو چاہے لے لے اور اُن پر شاعری خرچ کرلے وہ ہی لطف کلام میں پیدا کرلے۔ تو آج نہایت مشکل بات ہے۔ تمام عالم کی تعریفیں اور ہمارے شکریّے اُن مزاروں پر پھول برساتے ہیں۔ جن کے سونے والوں نے اُنہی چھوٹے چھوٹے احاطوں میں وہ کچھ کیا کہ سالہا سال چاہئیں جو ویسے لوگ پیدا ہوں۔ ویسی کوششیں کریں۔ اور ویسے ہی لطیف اور خوش آیند انداز عموماً زبان میں پیدا ہوں۔ تو بھی ہمیں مایوس ہونا نہ چاہئے اگر کوشش کرینگے۔ تو ہم بھی کُچھ نہ کُچھ کر رکھینگے۔ کیونکہ دلی دن بھر میں گلزار نہیں ہوگئی تھی اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ مضامین جو اب تک اُن احاطوں کو آباد کر رہے ہیں۔ وہ خود اس قیامت کے مضمون ہیں جن شیطان ملعون نے اپنے سارے مزے کوٹ کوٹ کر بھر دئے ہیں۔ اگر کسی شاعر کی زبان میں قدرتی لذت کم ہو۔ تو بھی مضامین مذکورہ اپنی گرمی سے رنجک کی طرح شعر کو لے اُڑتے ہیں۔ البتہ عام مضامین میں ایسی چمک دمک پیدا

کرنے کے لئے ایک قدرتی قوت زبان و بیان کی اور اصلی فصاحت اعلےٰ درجے کی چاہیئے۔ تب ہر ایک مضمون کو ویسا ہی گرمائے جسے سُننے والے کا دل پھڑک کر لوٹ جائے اگرچہ مدت سے مجھے اور اکثر اہل وطن کو اس کا خیال ہے۔ مگر اب تقریر میں آنے کا باعث یہ ہے کہ دیکھتا ہوں آج کل ہماری گورنمنٹ اور اُن اراکین کو اس طرف توجہ ہوئی ہے۔ جن کے دل ہماری تعلیم کا ذمہ اُٹھائے ہوئے ہیں۔ حق پوچھو تو ہماری انشا کے ستارۂ اقبال کی مبارک ساعت ہے۔ اس موقع پر ہماری تھوڑی کوشش بھی بہت سا اثر کریگی ✥

میرے اہل وطن! تمہاری جماعت دو فرقوں سے مرکب ہے۔ ایک ہندو ایک مسلمان۔ تم جانتے ہو۔ کہ ہندو کون ہیں؟ ہندو وہ ہیں۔ کہ آج ہم جس بات کی آرزو کرتے ہیں۔ وہ اُن کی زبان کا اصلی جوہر ہے۔ اگر بھاشا ہے۔ تو وہ اصلی حالتوں کے ادا کرنے میں سب پر فائق ہے۔ سنسکرت کی قوتِ نظم خود حد بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ مضامین شاعرانہ درکنار۔ اُس نے تاریخ سے لے کر جغرافیہ۔ طب۔ منطق۔ فقہ تک جس علم کو لیا۔ نظم کی جنتری میں کھینچ لیا۔ دوسرا جزو مسلمان۔ جن کی اصل عرب۔ عربی وہ زبان ہے کہ جس میں مرد تو بالائے طاق۔ گھروں کی عورتیں۔ بلکہ لونڈیاں جب اپنے جوش تقریر پر آتی تھیں تو اُن کا کلام ایک پُر زور نظم ہو جاتا تھا۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ ایسے بزرگوں کی اولاد اپنے بزرگوں کی میراثوں سے محروم ہو۔ کیا یہ حیف کی جگہ نہیں کہ آج ہماری زبان حرف تاثیر سے خالی ہو۔ کیا یہ رنج کی جگہ نہیں کہ اَوروں کے سامنے ہماری زبان ضعف بیانی کے ساتھ ہزار نقصوں سے مطعون ہو۔ اے خاک ہندوستان اگر تجھ میں امرؤالقیس اور لبید نہیں تو کوئی کالیداس ہی نکال۔ اے ہندوستان کے صحرا و دشت فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی والمیک ہی پیدا کر دو۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ شاعری کے لئے اوّل قدرتی جوہر بعد اُس کے چند تحصیلی اور علمی لیاقتیں چاہئیں۔ بعد اس کے شوق کامل اور مشق دوامی۔ میں نثر کے میدان میں بھی سوار نہیں۔ پیادہ ہوں۔ اور نظم میں خاک اُفتادہ۔ مگر سادہ لوحی دیکھو کہ ہر میدان میں دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ یہ فقط اس خیال سے ہے کہ میرے وطن کے لئے شائد کوئی کام کی بات نکل آئے۔ میں نے آج کل چند نظمیں مثنوی کے طور پر مختلف مضامین میں لکھی ہیں۔ جنہیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوتا ہوں۔ لیکن مطالب ومعانی کے مصوّروں سے جیسی تصویر کا کھنچوانا مطلوب ہو نمونہ کے لئے اُس کا خاکا دکھانا ضرور ہے۔ اگر اہل ظرافت میرا خاکا اُڑائیں تو اُڑائیں مجھے اس کا بھی خیال نہیں کیونکہ ہنسی ایک علامت خوشی کی ہے۔ اگر میں اپنے وطن کے لئے ہنسی کا سامان ہوں تو مجھے رنج نہیں بلکہ فخر ہے۔ چنانچہ ایک مثنوی جو رات کی حالت پر میں نے لکھی ہے اس وقت گذارش کرتا ہوں۔ اہل نظر یہ بھی دیکھینگے کہ آزادی نے اس میں کئی قسم کی قیدوں کو توڑا ہے۔ ایک اُن میں سے یہ کہ مثنوی ہے مگر جو معمولی بحریں مثنوی کی رائج ہیں اُن سے قدم بڑھائے ہوئے ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ اُن بحروں میں گنجائش کم ہے۔ ساتھ اس کے یہ کہ جو بحریں مثنوی کی خاص ہیں اُنہیں کسی مذہب نے خاص نہیں کیا۔ اب کہ ہمیں علے العموم ہر قسم کے مضامین کا نظم کرنا ہے پس کچھ گناہ نہ ہوگا اگر ہم قصیدہ یا غزل کی بحر میں مثنوی کہ دیں ؎

محمد حسین آزاد۔ لاہور۔ ۸ مئی ۱۸۷۴ء

مجموعۂ نظم آزاد

شبِ قدر

اے آفتاب صبح سے نِکلا ہوا ہے تو
عالم کے کار و بار میں دِن بھر رہا ہے تو

ہر چند شہسوار کو گردش مدام ہے
دن گرم ہو کہ سرد۔ سفر اُس کا کام ہے

پر دیکھتا ہوں میں کہ ترا رنگ زرد ہے
رخسارِ تابناک پہ کُلفت کی گرد ہے

اے آفتابِ دہر بہت کم ہے شام میں
اور تو بھی ہے تھکا ہوا دن بھر کے کام میں

دامن میں کوہسار کے تا صبح لیٹ کے
سُو رَہ لحافِ ابر میں مُنہ کو لپیٹ کے

روشن تھا تیرے نور سے روئے زمیں تمام
کیسی زمیں کہ گنبدِ چرخِ بریں تمام

عالم تھا تجھ سے نور کا گنجینہ ہو رہا
دنیا کا کار و بار تھا آئینہ ہو رہا

پر جاتا ہے تو کہ فلک سبزہ زار ہے
اور اس چمن کا رنگ بدلنا بہار ہے

رخصت ہو تو کہ آتی شبِ مشک ریز ہے
دن بھاگا جاتا آگے گریزا گریز ہے

اب ہوگا شاہزادیِ شب کا عمل یہاں
اور دن کا حکم رات سے ہوگا بدل یہاں

آ اے شبِ سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو
عالم میں شاہزادیِ مشکیں نسب ہے تو

تو اپنے انتظام میں راحت نظام ہے
قانونِ سلطنت ترا آرامِ عام ہے

چلتا ہے تیرا حکم اندھیرے جہان میں
جو چاہے دیکھ لیوے زمیں آسمان میں

فرماں جو تیرا ہوتا ہے جاری جہان پر
لیتے سب اُس کو آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر

تو رنگِ حلم ہے جو زمانے پہ پھیرتی
گویا کہ مشک اُڑتی ہے عنبر بکھیرتی

مُنہ پر ترے نقاب پڑی دودِ آہ کی
پوشاک پرنیان و حریرِ سیاہ کی

دامانِ حشر سے ترا دامن بندھا ہوا
گویا کہ ہے نشاں کا پھریرا کھُلا ہوا

جلوہ عجب ہے تیرے شہانے جلوس کا
اُڑتا ہے تیرا تختِ رواں آبنوس کا

قطعہ

اے رات سُنتا ہوں کہ ترے سر پہ تاج ہے
ہر گوہر اُس میں ملکِ حبش کا خراج ہے

ہوں پوچھتا مگر کوئی بتلاتا کچھ نہیں
ایسا سیاہ ہے کہ نظر آتا کچھ نہیں

ہر چند حُسن مہر میں کیا کیا پھبن نہیں
پر وہ دمک ہے تجھ میں کہ جس میں کرن نہیں

روشن تجھی سے روے زمیں پر چراغ ہیں
اور کھلتے آسماں پہ ستاروں کے باغ ہیں

بجلی ہنسی تو اُس کی تجھی سے بہار ہے
شبنم سے تیرا فیضِ کرم آشکار ہے

اے رات سلطنت کا تری دیکھ کر حشم
کھاتا فلک ہے تاروں بھری رات کی قسم

اس وقت میں جو غور ہوں کرتا جہان پر
اور ہوں خیال کرتا زمین آسمان پر

ہوں دیکھتا کہ چاروں طرف چھائی رات ہے
ہے وہ شُل کہ رات ہے یا حق کی ذات ہے

خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی
تو ہے کہ سائیں سائیں ہے کرتی کھڑی ہوئی

سوتا گدا ہے خاک پہ اور شاہ تخت پر
ماہی ہے زیرِ آب ہے طائر درخت پر

آرام کے بچھونے پہ یاں کوئی گھر میں ہے
دامن پہ دشت کے کوئی سویا سفر میں ہے
گھوڑے پہ ہے گا اونگھتا جاتا سوار بھی
اور سو گیا ہے راہزنِ نابکار بھی
ہے مست نیند میں کوئی دولہا برات کا
اور کاٹنا کٹھن ہے کہیں غم کی رات کا
زاہد مراقبہ کا ہے دم سب کو دے رہا
اور آپ مارے نیند کے جھوکے ہے لے رہا
انگڑائی لے کے ہے کوئی خوش مست اینڈتا
اور کوئی مست ہے کہ ہے یکدست اینڈتا

ہفتم

القصہ ہے امیر کہ کوئی فقیر ہے
عورت ہے یا کہ مرد جواں ہے کہ پیر ہے
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں
سب آگئے ہیں نیند کی اس دم لپیٹ میں
سونے کو نہر بھی ہے بہ خوابِ عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا
اے رات تیری وصف کہاں تک رقم کروں
اور اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں

ہشتم

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر
بیٹھا تھا جس کا سکہ زمین آسمان پر
کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق برق سے
رکھ کر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے
اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے
سکہ ہے اب ستاروں پہ اور تیرا نام ہے
محنت ثمر تھا اس کا تو راحت ہے پھل ترا
چاندی تھا اس کا حکم تو سونا عمل ترا

نہم

مزدور تھے جو دن کو مصیبت اٹھا رہے
اور پاؤں تک سروں کے پسینے بہا رہے
سو سو طرح کے بار دلوں پہ اٹھائے ہیں
جب چار پیسے شام کو لے گھر میں آئے ہیں
اے شب تمام دن کی مصیبت سے ہار کے
تیرے عمل میں پاؤں ہیں سوتے پسار کے
دن بھر کے ہیں مسافرِ محنت زدہ بہت
آوارۂ تا بشام ہیں شامت زدہ بہت
آئے ہیں کوہ و دشت کی منزل کو مار کے
رستے میں بوجھ تک نہیں رکھا اتار کے
ڈالا جو تم نے دامنِ رحمت کا سایہ ہے
اس وقت ان بچاروں نے آرام پایا ہے

اکثر امیر ہیں کہ یہاں بے نظیر ہیں
دولت کے آسمان پہ بدرِ منیر ہیں
ان کو خدا کی یاد نہ بندوں کی شرم ہے
دن ہو کہ رات عیش کا بازار گرم ہے
یاروں کے ساتھ اوّلِ شب کھیل کود میں
کچھ رات کو گذار کے رقص و سرود میں
اب بند میں ہیں نیند کے یوں بند ہو رہے
گویا کہ ہیں بچھونوں کے پیوند ہو رہے
اکثر امیر ہیں کہ شگفتہ دماغ ہیں
رکھتے ہوائے عیش سے دل باغ باغ ہیں
ہے روز وہ بہار کہ نوروز مات ہے
اور شب کو جا کے دیکھیے تو شب برات ہے
پر آب نمک کا آنکھوں میں کرتی ہے کام شب
پل بھر کی نیند کو ہیں ترستے تمام شب
دیکھیں گے خواب میں بھی نہ لطفِ حیات کو
کانٹوں پہ لوٹ لوٹ کے کاٹیں گے رات کو

اور برخلاف ان کے اک آفت نصیب ہے
پر اس معاملہ میں وہ ان کا رقیب ہے
دن بھر تو جاں کو توڑ کے کرتا ہے کام کو
اور حق حلال کر کے گھر آتا ہے شام کو
اب اپنے نانِ خشک کو پانی میں چور کر
کھایا ہے اور مست پڑا ہے تنور پر
مُردوں سے شرط باندھی ہے کمّل کو تان کر
آئے جو حشر بھی تو چلے جوں نہ کان پر
لیکن نہ جاننا کہ جو ارامِ عام ہے
یہ سب جہان کے لئے غفلت کا جام ہے
بندے خدا کے ایسے بھی یاں بےشمار ہیں
جو دن سے زیادہ رات کو مصروفِ کار ہیں

عالِم کو دیکھو محو ہے بیٹھا کتاب پر
آتا ہے فصل پر کبھی جاتا ہے باب پر
لفظوں میں غور ہے کبھی مضمونِ پاک میں
ہو جیسے کوئی ڈھونڈتا سونے کو خاک میں
لیکن کبھی مقاصدِ اعلیٰ سے چھوٹ کے
کرتا ہے رد و قدح بہت جھوٹ موٹ کے
دیتا ہے لفظ لفظ کو معنی نئے نئے
دکھلاتا زورِ طبع ہے یعنی نئے نئے
پھر آپ ہی کچھ سوال ہے آپ ہی جواب ہے
کر لیتا دل ہی دل میں حساب و کتاب ہے

ہیں مدرسہ کے طالبِ علم اور ذکر میں — بیٹھے ہیں امتحان کے دینے کی فکر میں
کرتے کبھی سوال ہیں آپس میں دَور سے — کرتے کبھی مطالعہ ہیں اور طور سے
اس غور سے جھکے ہوئے ہیں پیچ و تاب میں — جس طرح پیٹھ جاتے ہیں کیڑے کتاب میں
پر دیکھئے کہ لائقِ انعام کون ہو — کل کامیاب کون ہو ناکام کون ہو
پڑھ لو جو کچھ کہ پڑھنا ہے شب درمیان ہے — کل اپنی اپنی جان ہے اور امتحان ہے
اور وہ جو لکھ پتی ہے مہاجن جہان میں — آدھی فصل ہے پر وہ ابھی ہے دُکان میں
گنتی میں دام دام کے ہے دم دئیے ہوئے — بیٹھا ہے آگے سب بہی کھاتا لئے ہوئے
ہے سارے لین دین کی میزان تمام کی — پر سوئے کیا کہ ہو نہیں ملتی چھدام کی
اے رات تیرے پردۂ دامن کی آڑ میں — اس وقت چور بھی ہے کہیں اپنی تاڑ میں
دیوار کود جاتا ہے اور چول اکھاڑتا — دیتا کہیں نقب ہے کہیں چھت کو پھاڑتا
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر — ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر
وہ تو یہاں نچوڑ رہا اس کی جان ہے — پر میرے دل میں آیا یہ رہ رہ کے دھیان ہے
یعنی کہ عمر بھر کی کمائی غریب کی — ہوتی ہے مفت نذرِ دزدِ شقی کے نصیب کی
پروردگار کون بھلا کس کو دیتا ہے — حق ہے کہ تو ہی دیتا ہے اور تو ہی لیتا ہے
لیکن ہے اس کی گھات میں اک چوکیدار بھی — ہے غافل اس کے وار سے یہ نابکار بھی
جب صبر پڑ گیا کسی بیکس کی آہ کا — سو دن تو چور کے ہیں پر اک دن ہے ساہ کا
اور صاحبِ نجوم اسی کالی رات میں — بیٹھا ہے دوربین لئے اپنی گھات میں
اک آنکھ آسمان پہ ہے اک کتاب پر — اور مٹ رہا ہے چاند گہن کے حساب پر
کٹتی ہے اس کی تارے ہی گن کر تمام رات — پر اب تو فکر ہے یہی دن بھر تمام رات

اِک جنتری بناؤں کہ سالِ جدید ہے ۔ لیکن جو ہووے جلد مرتّب تو عید ہے
عالم ہے سوتا بسترِ راحت پہ خواب میں ۔ شاعر بجائے خواب ہے پُر پیچ و تاب میں
اُس کو نہ ملک کی ہے نہ ہے مال کی ہوس ۔ دولت کی آرزو ہے نہ اقبال کی ہوس
ہے اپنے ذوق شوق میں بیٹھا جھکائے سر ۔ اور سر پہ آدھی رات اِدھر آدھی اُدھر
پھیلائے ہاتھ صورتِ امیدوار ہے ۔ کرتا یہی خدا سے دعا بار بار ہے
یارب نہیں ہے دولت و زر کی دعا مجھے ۔ ہے تجھ سے التجا تو یہی التجا مجھے
میرے سخن کو خلق میں تو کارگر کرے ۔ وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے
اور کوئی شاعر ایسا بھی روشن دماغ ہے ۔ اس وقت گھر میں بیٹھا جلائے چراغ ہے
ڈوبا ہوا ہے سر کو گریباں میں ڈال کے ۔ اُڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پر خیال کے
جس طرح باز لائے کبوتر کو مار کر ۔ یُوں لاتا آسماں سے ہے مضموں اُتار کر
لڑ جاتا ذہن ہے جو کبھی اور طور سے ۔ پھر ہے زمیں کی تہ میں اُتر جاتا غور سے
اور واں کے ذرّہ ذرّہ کو سب دیکھ بھال کے ۔ لاتا ہے صاف گوہرِ مضموں نکال کے
نکلا جو ایک بھی کوئی اُس آن مل گیا ۔ یوں خوش ہے جیسے تختِ سلیمان مل گیا
کرتا ہے اُس کو نظم پھر ایسے قرینے پر ۔ جس طرح کوئی نقش بٹھلائے نگینے پر
اور اس اندھیری رات میں شاعر جو چور ہے ۔ پھرتا ٹٹولتا ہوا مانند کور ہے
مضموں اُڑا رہا کسی شعر و غزل کے ہے ۔ لاتا مگر کچھ ایسا لفافہ بدل کے ہے
سُننے سے جسکے آنکھوں میں سرسوں سی پھول جائے ۔ دیکھے جو خود بھی صاحبِ مضموں تو بھول جائے
اے رات یہ جو تو نے سرِ شام آن کر ۔ سجادۂ سیاہ بچھایا ہے تان کر
اس پردہ حق پرست کہ یادِ خدا میں ہے ۔ بیٹھا خدا کی یاد سے خوف و رجا میں ہے

اُس کو اُسی کی ذات سے ہے لو لگی ہوئی　　اور دل میں ہے نقطہ یہ تگ و دو لگی ہوئی
کیونکر یہ شعلہ شمعِ تعلق سے چھوٹ کے　　ہو وصل نورِ پاک میں پھر ٹوٹ پھوٹ کے

دریا میں چل رہا کہیں اس دم جہاز ہے　　اہلِ جہاز جن کا خدا کارساز ہے
بیٹھے اُسی کی آس پہ ہیں دل دھرے ہوئے　　سینوں میں لاکھ حسرت و ارماں بھرے ہوئے
بادِ مراد دیتی ہوائے مراد ہے　　طوفان کا خطر مگر اُس سے زیاد ہے
اس واسطے نظر ہے کبھی بادبان پر　　حسرت سے دیکھتے ہیں کبھی آسمان پر
یہ سب کے سب ہیں بیٹھے ہوا کی امید میں　　اور ناخدا ہے بیٹھا خدا کی امید میں

ماں کو جو اپنے بچے سے اُلفت کمال ہے　　اس دم بھی دیکھو اُس کو اُسی کا خیال ہے
ہر چند کام کاج میں ہے گھر کے تھک رہی　　پر اُس کو ہاتھ سے ہے برابر تھپک رہی
سوتی پڑی خدا کی خدائی تمام ہے　　وہ اپنی میٹھی نیند کو کرتی حرام ہے
کہتی ہے یہ کہ مجھ کو پڑے یا نہ کل پڑے　　ایسا نہ ہو کہ چونک کے بچہ اُچھل پڑے
ماں کو تو سوتے جاگتے اس کا ہی دھیان ہے　　کروٹ نہیں بدلتی کہ ننھی سی جان ہے

پر جائے حیف حال اُسی جاں بلب کا ہے　　سب کہہ رہے ہیں جس کو کہ مہمان شب کا ہے
دن بھر دوا غذا میں رہا غیر حال ہے　　لیکن ہے اب یہ حال کہ ہلنا محال ہے
بتی چراغِ عمر کی ہے جھلملا رہی　　اور بیکسی سرہانے ہے آنسو بہا رہی
اے رات مجھ کو دھیان یہی بار بار ہے　　اس کی تو زندگی کوئی دم کا شمار ہے
کون اُس کا ساتھ دیویگا ہو صبح جب تلک　　روئیگا کوئی شام کے مردے کو کب تلک

آزاد خوب لطف دیا تیری بات نے　　پر لی اب آسمان پہ کروٹ ہے رات نے
سب اپنے اپنے کام میں ہیں دل دئے ہوئے　　تو ایسا کیوں ہے ساغرِ غفلت پئے ہوئے

کوئی گھڑی تو ہوش و خرد سے بھی کام لے
وقتِ سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

ابرِ کرم

جو نکتہ یاب ہیں کتبِ انقلاب کے
دن رات کو سمجھتے ورق ہیں کتاب کے

دفتر ہے اُن کے سامنے ماضی و حال کا
جو آگے آئینہ ہے دکھاتا مثال کا

روشن سب اُس میں عہدِ بعید و قریب ہیں
شاہانِ ماسلف کے مرقّع عجیب ہیں

آتی ہے دمبدم نئی تصویر سامنے
تحریر تازہ لاتی ہے تقدیر سامنے

اس کشورِ فنا کا عجب طرز و طور ہے
دم بھر میں صورت اور ہے دم بھر میں اور ہے

قانونِ انقلاب یہاں رسم و راہ ہے
موسم بموسم اس میں نیا بادشاہ ہے

اب یاں جو چند روز سے جاری نظام تھا
گرمی کے بادشاہ کا گرم انتظام تھا

عالم تھا شعلہ خیز و فلک شعلہ ریز تھا
اک حُکم تھا جو گرم تو اک حُکم تیز تھا

مُنہ پر زمیں کے دیکھو تو ہے خاک اُڑ رہی
اور گرد چارسو تہِ افلاک اُڑ رہی

دنیا میں بوند بوند کو خلقت ترس رہی
پانی کی جائے آگ فلک سے برس رہی

شہروں میں سوکھ کے جنگل چمن ہوئے
اور جنگلوں میں دھوپ سے کالے ہرن ہوئے

طفلِ نبات پیاس کے مارے بلک رہے
خلقِ خدا کے نالے بہت دور تک گئے

سیماب ہو کے سینے سے ہر دل نکل چلا
اور آفتاب شمع کی صورت پگھل چلا

دل تشنگی کے مارے یہ بیتاب ہو گئے
انساں تڑپ کے ماہیِ بے آب ہو گئے

پر اب ہے دَوْر دورشہِ برشکال کا
چھایا فلک پہ ابر ہے جاہ و جلال کا

گرمی کا جو بخار تھا سارا نکل گیا
اور رنگ آسمان و زمیں کا بدل گیا

فرمان راحتِ سحر و شام آگیا
خلقِ خدا کی جان کو آرام آگیا

اے ابر آ کہ تُو توشہ برشکال ہے
جو خشک و تر ہے تیرے کرم سے نہال ہے

تیرے عمل کے واسطے رنگِ جہاں ہے اور
تیری زمیں ہے اور ترا آسماں ہے اور

نوروز آب و رنگ بہارِ جہان ہے
تُو نوبہار کشورِ ہندوستان ہے

اے ابر جوشِ سبزہ و گلبن نہیں ہے یہ
پھولے نہیں سماتی خوشی سے زمیں ہے یہ

مدت سے انتظار تھا تیرا جہان کو
آنکھیں سبھوں کی لگ گئی تھیں آسمان کو

آنے سے تیرے آگیا آنکھوں میں نور ہے
دیوار و در سے آج برستا سرور ہے

تیرے ہی دم قدم کی یہ سب لہر بہر ہے
سیراب کوہ و دشت تو شاداب شہر ہے

ہر قطرہ تیرا۔ قطرہ ہے آبِ حیات کا
پاتا حیات تجھ سے ہے عالم نبات کا

تو دودھ ہے نبات کے اطفال کے لئے
اور زندگی درختِ کہن سال کے لئے

اے ابر زور کیا کہوں میں تیرے شیر کے
دانہ پہاڑ کو ہے نکل آتا چیر کے

سب تجھ سے نونہالِ چمن سبز بخت ہیں
اور میوؤں سے بھرے ہوئے دامن درخت ہیں

یہ پھول پھل نہیں ہیں برابر نکل پڑے
ہیں حوصلے بہار کے باہر نکل پڑے

گہ پرنیانِ سبز اُڑھاتا زمیں کو ہے
پھولوں سے گاہ کرتا شگفتہ جبیں کو ہے

گردوں پہ کرتا عالمِ نیرنگ ہے کبھی
دکھلاتا ایک رنگ میں سو رنگ ہے کبھی

سیمابِ صبح میں کبھی شنگرف گھولنا
اور وہ نگارخانۂ چینی کا کھولنا

لاتا کبھی کچھ اور ہی جوش و خروش ہے
کرتا فلک کو بادلوں سے دگلہ پوش ہے

یوں رنگ دمبدم جو بدلتا جہاں کے ہے
اے ابر سیکھی شعبدہ بازی کہاں سے ہے

اے ابر جب تو آتا ہے میداں پہ اوج کے
دَل بادل آگے پیچھے لئے ساتھ فوج کے
آتا ہے دیوزاد کی صورت بنا کے تو
اور بال و پر نمد کے ہے اُڑتا لگا کے تو
اُس وقت تیرے رعد کی آواز ہے غضب
اے ابر تیرے ساتھ یہ دمساز ہے غضب
بل بے تری گرج کہ دلِ زار ہل گئے
ہیبت سے رعد و برق کے۔ کہسار ہل گئے

لیکن جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہیں آرہیں
اور ٹہنیوں کے سازوں پہ سُر ہیں مِلا رہیں
کوئل کی کوک اور پپیہے کا بولنا
اور میٹھی بولیوں میں وہ شربت کا گھولنا
اے ابر سب یہ ساز و نوا تیرے دم سے ہیں
یہ لطفِ عیش و لطفِ ہوا تیرے دم سے ہیں

غنچوں کے مارے پیاس کے تھے مُنہ کھلے ہوئے
گلشن کے نونہالوں کے مُنکے ڈھلے ہوئے
انسان پھرتے پیاس سے تھے بدحواس سے
مُنہ کھولے تھے کبوتر و کنجشک پیاس سے
رونق سبھوں کے مُنہ پہ ہے اس آن آگئی
آنے سے تیرے جان میں ہے جان آگئی

تیرا خطاب رحمت پروردگار ہے
خلقِ خدا کے رزق کا تو ذمہ وار ہے
سرمایہ تو ہی دیتا ہے تجار کے لئے
اور سایۂ ہما ہے زمیندار کے لئے
اے ابر وہ جو خلق میں دہقان پیر ہیں
عمریں ہوئیں لکیر پہ پیٹے فقیر ہیں
اُن کو امید تھی - نہ کسی کی پناہ تھی
تجھ پر نظر تھی یا کہ خدا پر نگاہ تھی
آج اپنے رنج و فکر سے اُن کو فراغ ہیں
ہیں بیٹھے اپنے کھیتوں پہ اور باغ باغ ہیں

اے ابر تیرے فضل کا ہر جا وفور ہے
ہر کوہ و کوہسار میں کچھ اور نور ہے
ہیں سب پہاڑ پھولوں سے دامن بھرے کھڑے
اور گلبنوں سے لے کے شجر تک ہرے کھڑے
چشمے ہیں جابجا تری رحمت کے بہہ رہے
گویا زبان موج سے ہیں وصف کہہ رہے
ریتی پہ خشک لب تھا جو دریا پڑا ہوا
ہو جیسے کوئی سانپ سسکتا پڑا ہوا

اب پوچھتا فلک سے ہے مقدار اوج کی
دیکھو میں آیا توڑ کے زنجیریں موج کی

دیوانہ وار کھٹ بہ لبِ آب مارنا
گاہے تھپیڑے ہے گہے گرداب مارنا

یہ جوش یہ خروش سما ہے دکھا رہا
ہر موج میں ہے نوح کا طوفاں اُٹھا رہا

پر مجھ کو رشک ہے اُسی مستِ مدام پر
جس کی کہ میکشی نہیں موقوف جام پر

مستانہ پن میں رکھتا ہے دیوانہ طور بھی
مستانے ساتھ رکھتا ہے دو چار اور بھی

سبزہ پہ لوٹتا ہے دماغ آسماں پہ ہے
اور دمبدم یہ مطلعِ موزوں زباں پہ ہے

یوں پھوٹ کر جو ہیں گل و ریحاں نکل پڑے
کیا جانے کن دلوں کے ہیں ارماں نکل پڑے

اے ابر تُو تو چھایا ہوا ہے جہان پر
چھایا ہوا سما ہے زمیں آسمان پر

چلنا وہ بادلوں کا زمیں چُوم چُوم کر
اور اُٹھنا آسماں کی طرف جُھوم جُھوم کر

بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی
سبزے کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی

آتی اِدھر صبا ہے اُدھر سے نسیم بھی
اور اُن کے ساتھ ساتھ ہے آتی شمیم بھی

مستی میں جُھومنا وہ جوانانِ باغ کا
جُھک جُھک کے لینا ہاتھ سے گُل کے ایاغ کا

سبزہ کے عکس سے در و دیوار سبز سبز
سیراب باغ و دشت تو کہسار سبز سبز

ان سبز سبز کیاریوں پر دل ہیں لوٹتے
طوطی برنگ طائرِ بسمل ہیں لوٹتے

شبنم عجب بہار ہے اپنی دکھا رہی
موتی بکھیرتی ہے جواہر لُٹا رہی

سبزے کے برگ برگ میں موتی جڑے ہوئے
شاخ و شجر تمام مرصّع کھڑے ہوئے

پتوں پہ جب تلک ہیں تو مینا نگار ہیں
ٹپکے اگر ہوا سے تو ہیرے کا ہار ہیں

شبنم کا جوش گریہی طوفاں اُٹھائیگا
ہیرا چمن کی اوس پہ الماس کھائیگا

لو بادل اب گرجتے ہوئے سر پہ آگئے
اور شامیانے شرق سے تا غرب چھا گئے

کیا مست آیا جھوم کے سرشار ابر ہے
برسیگا آج خوب دھواں دھار ابر ہے

آیا اُمنڈ گھمنڈ کے عجب دھوندو کار ہے
نودن کی گر لگا دے جھڑی تو بہار ہے

لیکن یہ باجرا سا برسنا پھوار کا
ہیگا پیام ابرِ بہاری کی تار کا

بوندوں میں جھومنی وہ درختوں کی ڈالیاں
اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں

وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے
وہ کیاریاں بھری ہوئیں تھالی جھلک رہے

آبِ رواں کا نالیوں میں لہر مارنا
اور روئے سبزہ زار کا دھوکر سنوارنا

گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے
اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے

جل تھل ہیں کوہ و دشت ہیں تالاب آب کے
گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے

ہر جا پہ طائرانِ چمن غول غول ہیں
آپس میں بول بول کے کرتے کلول ہیں

کوئل کا دُور درختوں میں بولنا
اور دل میں اہلِ درد کے نشتر گھنگولنا

طاؤس کا وہ دُم کو چنوّر کر کے ناچنا
اور مورنی کا اشک کے موتی کو جانچنا

لیکن چمن سے ناچ کے چلتا جو مور ہے
اک قہقہہ بہ طنز لگاتا چکور ہے

اِملی کے اک درخت میں جھولا پڑا ہوا
اور ساتھ اُس کے آم کا ٹپکا لگا ہوا

جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں چڑھا رہے
اور نیچے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے

ساون کے گیت اُٹھا رہے طوفاں دلوں میں ہیں
پردیسیوں کی یاد سے ارماں دلوں میں ہیں

ہر تان میں ملہار کے مستی کا شور ہے
بادل گرج کے پردے میں دیتا ٹکور ہے

اے ابرِ تیری رات کی تعریف گر کروں
لازم ہے پہلے مَیں رہِ ظلمات سر کروں

کیا کیا بیاں کروں میں تری رات کا مزا
گر رات کا مزا ہے تو برسات کا مزا

سنسان رات اور وہ آئی ہوئی گھٹا
چاروں طرف جہان میں چھائی ہوئی گھٹا

بجلی کبھی نگہ فتنہ ساز سے
کرتی نقابِ ابر میں چشمک ہے ناز سے

اور کوکنا پپیہے کا وہ دل کی ہوک سے
نالے کو اپنے تولنا کوئل کی کوک سے

کوٹھے پہ ٹھنڈے ٹھنڈے بچھونے وہ اوس میں
ہے گل کو فخر - آئے اگر پائے بوس میں

آنا وہ بھیگی بھیگی ہوا کا کبھی کبھی
بول اُٹھنا مرغِ نغمہ سرا کا کبھی کبھی

آرام کہ رہا ہے کہ میرے ہی ہو رہو
قسمیں ہے دیتی نیند کہ بس اب تو سو رہو

آزاد لکھتے لکھتے ہی آدھی تو ڈھل گئی
اور شمع لالٹین میں ساری پگل گئی

طولِ امل کو اپنے اب انجام دیجئے
کوئی گھڑی تو آپ بھی آرام کیجئے

موسمِ زمستان

آ زمستاں کہ ہے تو بادشہِ برفانی
شاہ برفانی و شاہنشہ برفستانی

تخت اقبال ہے عالم سے نرالا تیرا
اور ہے دربار سرِ کوہِ ہمالہ تیرا

شرق تا غرب ترا ملک ہے ہر طرف سفید
اُڑ رہا پرچمِ اقبال ہے جوں برف سفید

جبکہ عالم پہ ہے تو لشکرِ جنگی لاتا
کوہ و صحرا کو برابر ہے اُلٹتا آتا

بادِ صرصر ہے نشاں تیرا اُڑاتی آتی
فوج اقبال کو رستہ ہے بتاتی آتی

طرفۃ العین میں کر لیتا ہے تسخیر جہاں
تیرے آتے ہی بدل جاتی ہے تاثیرِ جہاں

جس طرف تیرے پھریرے کا ہے جھوکا جاتا
مارے ہیبت کے ہے دل سینوں میں ٹھہرا جاتا

ہے نباتات کا عالم تہ و بالا تجھ سے
پرزے پرزے ہے گلستاں کا رسالہ تجھ سے

باغ پر جب ہے ترے قہر کا جھوکا آتا
ڈر کے ہر برگ ہے پیوندِ زمیں ہو جاتا

تیرے سناٹے سے ہوتی ہے ہوا جانِ نبات
خوف کے مارے دہل جاتے ہیں طفلانِ نبات

تھرتھراتے ہیں کھڑے سارے جوانانِ چمن
مُنہ چھپاتے ہیں گل و سنبل و ریحانِ چمن

ہیں شجر سر پہ کھڑے خاک اُڑاتے سارے
گل و گلزار ہیں ویراں نظر آتے سارے

نغمہ سنجانِ چمن - پَر ہیں پھُلائے بیٹھے
اور پر و بال میں ہیں مُنہ کو چھپائے بیٹھے

باغباں کا جو گلستاں میں گذر ہوتا ہے
لب حیرت سے یہی کہتا ہے اور روتا ہے

یاالٰہی وہ جوانانِ چمن ہو گئے کیا
باغ سُنسان ہے مرغانِ چمن ہو گئے کیا

رازِ غم کس سے کھُلے باغ میں بُلبل بھی نہیں
کان میں پوچھئے کس سے کہ رہا گل بھی نہیں

نہ تو غنچہ کوئی باقی ہے کہ جو منہ کھولے
نہ ہے گلزار میں سوسن جو زباں سے بولے

کہ درختانِ چمن باغ میں عُریاں کیوں ہیں
ہاتھ پھیلائے کھڑے ششدر و حیراں کیوں ہیں

اے زمستاں جو ہوئی خامہ سے ہے بوالعجبی
فی الحقیقت ہوئی خدمت میں تری بے ادبی

تجھ سے ہے دور ہواؤں کی کثافت ہوتی
دفعِ زہرِ حشَراتی کی ہے آفت ہوتی

خلق سے دفع وباؤں کی بلا ہوتی ہے
اور مریضوں کو ترے دم سے شفا ہوتی ہے

خشک ہوتی ہے مزاجوں کی رطوبت تجھ سے
پاتا ہر میوۂ شیریں ہے عذوبت تجھ سے

تو نے ہے صاف جہاں قاف سے تاقاف کیا
شیشۂ گنبد فیروزہ ہے شفاف کیا

مخمل و قاقم و سنجاب پہنائے تو نے
بہت اثمار تر و خشک کھلائے تو نے

تُو نہ تھا جب تو نہ تھا جان کو جینے کا مزا
تھا نہ کھانے کا مزا اور نہ پینے کا مزا

اب عمل میں ترے آرام سے سب جیتے ہیں
گرم کھاتے ہیں غذا آب خنک پیتے ہیں

یا تو گرمی سے نہ تھا پاس بھی بیٹھا جاتا
اور بغل سے دلِ وحشت زدہ نکلا جاتا

یا ہیں اب ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے لیتے
آگ ہاتھ آئی تو ہیں دل میں چھپائے لیتے

مارے سردی کے جگر سینوں میں تھراتے ہیں
بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں

ہے کوئی چھینٹ کا اوڑھے ہوئے فرغل بیٹھا
پر پھلائے ہوئے جیسے کوئی بلبل بیٹھا

اوڑھ بیٹھا کوئی سردی سے لحاف اپنا ہے
کوئی کر بیٹھا بچھونے کو غلاف اپنا ہے

کچھ لحافوں سے ابھی مُنہ کو نکالے ہیں پڑے
لیکن انگیٹھی کو پہلو میں سنبھالے ہیں پڑے

کئی سکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کئی کانپتے ہیں
ہیں کئی کانپتے سردی سے کئی ہانپتے ہیں

کہیں سُو سُو کہیں سی سی ہے کہیں سیٹھی ہے
گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں انگیٹھی ہے

حال دیکھے ہیں جو یہ خلق کی بدحالی کے
رونگٹے ہو گئے سردی سے کھڑے قالی کے

اُس کی ہر بیل میں چپ چھپ کے ہیں سنبل بیٹھے
پردۂ رنگ میں ہیں دبکے ہوئے گل بیٹھے

خلق سے گرمی و سردی کی جو ہے لاگ لگی
تن تو ٹھنڈے ہیں پڑی سینوں میں ہے آگ لگی

ہر نفس بھاپ کے پردے میں نکلتے ہیں دھوئیں
دل میں ہے آگ لگی مُنہ سے اُگلتے ہیں دھوئیں

تیرے افضال سخاوت تہِ افلاک ہیں عام
ملتی سب اہل جہاں کے لئے پوشاک ہے عام

اہل دولت کو ہیں خلعت ہیں دوشالے ہوتے
غربا سارے ہیں کمّل کے حوالے ہوتے

کر دیا تو نے ہے خلقت کو ہر اک حال میں مست
ہے کوئی کھال میں مست اور کوئی شال میں مست

خانِ عالم ہیں الگ بستر مخمل میں پڑے
فقرا لپٹے ہیں سب ایک ہی کمّل میں پڑے

اے زمستاں کہوں کس طرح تری رات کا لطف
تیری شبہائے دراز اور وہ ہر بات کا لطف

کی تری رات نے داناؤں کی ہے بات بڑی
کہ کبھی دن ہیں بڑے اور کبھی رات بڑی

ہے جواں لیتا اسی شب میں جوانی کا مزا
اور جو بڈھا ہے تو لیتا ہے کہانی کا مزا

بزم احباب کی صحبت کا مزا ہے تجھ سے
سازِ عشرت کے لئے برگ و نوا ہے تجھ سے

شبِ سرما ہی میں ہے گانے بجانے کا مزا
پان کھانے کا گلوری کے چبانے کا مزا

یار حقے کے مزے دود میں لیتے ہیں مزے
دُودِ تلخ اُس کے سوا دود سے لیتے ہیں مزے

گھونٹ حقے کے یہ ہر دم نہیں ہم بھرتے ہیں
اے زمستاں یہ ترے عشق کے دم بھرتے ہیں

صوفی و رند کے جلسے کا توہی ساقی ہے
مایۂ عیش و طرب دم سے ترے باقی ہے

ہر طرف ہے جو پیالی پہ پیالی اُڑتی
مے نہیں ہے یہ ہے تصویرِ خیالی اُڑتی

بے نشے مست پڑے شکرِ خدا کرتے ہیں
چائیں پی پی کے ترے سر کو دعا کرتے ہیں

شب سرما میں اگر لطف ہے مے نوشی کا
تو اسی شب ہے مزا مجلسِ خاموشی کا

ہیں کبھی عالمِ ارواح کے مہماں آتے
بزمِ دربار میں ہیں صاحبِ فرماں آتے

دل کے ایواں میں ہیں آکے عدالت کرتے
ہیں کتابوں کے وکیل اُن کی وکالت کرتے

ہوتی اتنے میں ہے افلاک پہ تنویرِ سحر
ٹیکتا آتا ہے مشرق سے عصا پیرِ سحر

سر پہ وہ اپنے بکھیرے ہوئے ہے موئے سفید
ریش پُر نور میں ہے جلوہ نما روئے سفید

شجرِ طور کا عالم ہے بناتا آتا
ساتھ ہی کوہ ہمالہ کو اُٹھاتا لاتا

ہند کو کابل و کشمیر بنا دیتا ہے
ملک تاتار کی تصویر بنا دیتا ہے

گرچہ ہر جا پہ ترے چلتے قوانین ہیں اور
اے زمستاں ترے اُس ملک میں آئین ہیں اور

ایک جھوکا جو ترے حُکم کا آجاتا ہے
تو نباتات کا سب رنگ بدل جاتا ہے

زرد ہو جاتے ہیں سب دشت سے کہسار تلک
کوہ سے کاہ تلک باغ سے اشجار تلک

واں اسی فصل میں گویا نظر آتی ہے بسنت
زعفراں پوش درختوں کو بناتی ہے بسنت

عقل حیراں ہے کہ سونا یہ بکھیرا کس نے
آبِ زر روے نباتات پہ پھیرا کس نے

بعض اشجار پہ ہے حُکم بہت سخت آتا
پتے پتے کو جلاتا ہوا ایک لخت آتا

دل میں ہر برگ کے یوں آگ لگا دیتا ہے
جس طرح سے کوئی تانبے کو تپا دیتا ہے

ہر شجر پر ہے غرض رنگ بدل کر آتا
کہیں زرکار ہے آتا کہیں مس گر آتا

تیسرے حکم کے جھونکے میں سوا تیزی ہے
کہ نباتات پہ طوفانِ بلا ریزی ہے

برگ دیکھو تو ہیں سب جھڑ کے سرِ خاک پڑے
اور شجر سب ہیں برہنہ تہ افلاک کھڑے

دفعتہً پیرِ سحر سانس سے ہے بھرتا ایسا
یا زمانے پہ وہ کچھ سحر ہے کرتا ایسا

کہ جہاں آنکھوں میں ہو جاتا ہے یکبار سفید
دشت و کہسار سے لے تا در و دیوار سفید

ابر کی طرح بخارات کا گھیر کر آنا
برف کے پردے میں وہ روئی دھنکتے جانا

ہلکے ہلکے کبھی مکڑی کے ہیں جالے اڑتے
اور ہواؤں میں ہیں کبھی روئی کے گالے اڑتے

جا بجا آبِ رواں چلنے سے ہیں تھم جاتے
اور سر چشمہ میں شیشے کی طرح جم جاتے

جو شجر گلشنِ ہستی میں برہنہ تھے کھڑے
یا کہ پتّوں کا بڑھائے ہوئے گہنا تھے کھڑے

شجرِ نور سرِ طور نظر آتے ہیں
سربسر غیرتِ بلّور نظر آتے ہیں

ہیں زمستاں ترے سب کام زمانے سے الگ
یہ لطیفہ ہے مگر فہم میں آنے سے الگ

جامِ گردوں میں ہے تو شیر جماتا کیونکر
اور ہوا میں ہے تبا شیر اُڑاتا کیونکر

ابر و باراں تو تہ چرخِ بریں دیکھا تھا
یہ برستا ہوا کافور نہیں دیکھا تھا

جبکہ ہوتا ہے گذر جانبِ کہسار ترا
فن صنعت ہے وہاں اور کچھ اے یار ترا

بُت تراشی میں ہے تو غیرتِ فرہاد وہاں
قصرِ شیریں کی ہے تو ڈالتا بنیاد وہاں

اک طلسمات کا عالم ہے دکھاتا جاتا
صورتیں برف سے کیا کیا ہے بناتا جاتا

پتّے پتّے کا ہے تصویر میں انداز درست
اور ہر اک میوہ ہے قدرت سے خدا ساز درست

اژدہا دامنِ کہسار میں سوتا ہے وہیں
برف کا اسپ سبک خیز بھی ہوتا ہے وہیں

ہے کہیں دیو کی تصویر نمودار کھڑی
اور پری ہے پر پرواز سے تیار کھڑی

چیتا کہتا ہے کہیں جست ابھی کرجاتا ہوں — اور ہرن کہتا ہے میں چوکڑی ابھی بھر جاتا ہوں

برف کا بیل کہیں سر ہے جھکائے بیٹھا — اور کہیں اونٹ ہے گردن کو اٹھائے بیٹھا

شیر وابستۂ زنجیر بناتا ہے وہیں — اور کبھی فیل کی تصویر بناتا ہے وہیں

کبھی انسان کبھی حیوان بنا دیتا ہے — اور کبھی صورت شیطان بنا دیتا ہے

اے زمستاں جو کبھی آذر و فرہاد ہے تو — تو کبھی رشک دہ مانی و بہزاد ہے تو

برف سے جب ہے نکھرتا فلکِ زنگاری — اور تری طبع ہے آتی سوئے رنگیں کاری

کسی صیاد کو ہے کرکے ضیافت لاتا — اور کوئی صید ہے سرگشتہ آفت لاتا

لیتا پھر کارِ قلم ہے دمِ شمشیر سے تو — اور ہے شنگرف کو لیتا رگِ نخچیر سے تو

کی سرِ خاک جو تھی برف نے سیمیں کاری — خونِ بے جرم سے کرتا ہے اُسے گلناری

صید نومید کا خوں رنگ جو دکھلاتا ہے — تیر سا دیدۂ عبرت میں چبھا جاتا ہے

ہے گذر جبکہ ترا جانبِ دریا ہوتا — اِک طلسمات کا گویا ہے تماشا ہوتا

ایسا تو حکمتِ جادو سے جماتا ہے اُسے — سر بسر تختۂ الماس بناتا ہے اُسے

کاروانوں کی برابر ہیں قطاریں جاتیں — جس طرح دشت میں ہرنوں کی ہوں ڈاریں جاتیں

پل میں بے کشتی و پل پار اُتر جاتے ہیں — سفری سیکڑوں بے لاگ گذر جاتے ہیں

روے دریا پہ گذر مثل نظر ہوتا ہے — ایسے جاتے ہیں کہ دامن نہیں تر ہوتا ہے

گلشنِ دانش و فرہنگ جو ہے ملک فرنگ — اے زمستاں ہے وہاں تیرے عجب عیش کا رنگ

بارہ سنگے کہیں لگّی ہیں اُڑاتے جاتے — جلوۂ تختِ ہوادار دکھاتے جاتے

نوجواں ہیں کہ جوانی کی شرابوں سے ہیں مست — پہلواں بے مے و بے جام سالوں سے ہیں مست

زبس جوشِ دلی حوصلہ انگیزی ہیں — سب کمر بستہ ہیں میدان سبک خیزی ہیں

پاؤں ہیں کاٹ کے موزوں کو چڑھائے ہیں کھڑے / اور عصا اپنے سر برف جمائے ہیں کھڑے
قدم آگے کو رپٹ کر ہیں نکلتے جاتے / یہ اچھل جاتے ہیں اور آگے پھسلتے جاتے
کوئی گھڑ دوڑ میں جیتا کوئی ہارا ہوگا / پر رپٹ دوڑ کا میدان تو نہ مارا ہوگا
بس کر اے دل کہ نہیں لکھنے کی طاقت باقی / مارے سردی کے نہیں ہاتھ میں حالت باقی
دیکھ کاغذ کا ورق ہاتھ میں تھرّاتا ہے / اور قلم ہاتھ سے تھرّا کے گرا جاتا ہے
مارے سردی کے ہے سر اپنا جھکائے لیتا / مُنہ ہے کاغذ کی رضائی میں چھپائے لیتا
عرے اللہ تو ہی اب ہے بچانے والا / ترے **آزاد** کو جاڑے سے پڑا ہے پالا
آرزو کچھ نہیں دنیا کی رہی ہے دل میں / اب تمنّا جو ہے باقی تو یہی ہے دل میں
تپشِ عشق سے دل ہووے مرا نرم سدا / گرمیِ شعر و سخن سینہ رکھے گرم سدا

صبحِ اُمّید

جب کیا صبح نے روشن فلکِ مینائی / بسترِ خواب سے میں لے کے اُٹھا انگڑائی
آنکھ مل کر جو نظر کی سوئے میدانِ جہاں / ذرہ ذرہ میں نظر آیا رخِ جانِ جہاں
کام کرتی تھی جہاں تک نگہِ دور انداز / تھا کھلا آنکھوں کے آگے چمنِ قدرتِ راز
سبز و شاداب تمام ایک طرف دامنِ کوہ / جس پہ ہے فرشِ زمیں گلشنِ گردوں کی شکوہ
برگ برگ اُس کا ہے آئینہ لئے پیشِ نظر / جن میں ہیں جلوہ نما دل کی مرادوں کے ثمر
آرزوں سے کھلے ہیں گلِ رعنا یکسر / جن سے نکلینگے ثمرہائے تمنا یکسر
قُلّۂ کوہ کہ تھا چرخِ بریں سے ہمراز / رکھتا تھا طولِ امل سے بھی سوا راہ دراز

تھی تو ظاہر میں بہت سخت چڑھائی اُسکی　　اور مسافت بھی کسی نے نہیں پائی اُسکی
اُس پہ چڑھنے سے مگر تنگ نہ جی ہوتے تھے　　دم اُکھڑتے نہ تھے اور سینے قوی ہوتے تھے
گرچہ تھا پاؤں اُٹھانے کا نہ یارا دل کو　　کوئی دیتا تھا مگر ایسا سہارا دل کو
عقل ہر چند یہ کہتی تھی کہ ہے دُور بہت　　دل یہ کہتا تھا کہ ہمّت میں ہے مقدور بہت
جشنِ شاہانہ کا سامان نظر آتا تھا واں　　سازِ عشرت کوئی در پردہ بجاتا تھا وہاں
دل اُس آواز پہ اس طرح کھچے جاتے تھے　　جیسے ذرے سوئے خورشید اُڑے جاتے تھے
اس طرف میرا دلِ زار بھی یوں آہ چلا　　جیسے بلبل سوئے گُل کبک سوئے ماہ چلا
کاہ کی طرح سوئے کاہ ربا پہنچا میں　　الغرض منزلِ مقصود پہ جا پہنچا میں
دیکھا اک باغ کہ قدرت نے لگایا ہے وہاں　　گُلِ خودرو نے عجب جلوہ دکھایا ہے وہاں
مخملِ سبز سے ہے سبزۂ تر پا انداز　　رنگِ گُل اُس پہ دکھاتے ہیں تماشا انداز
بر سرِ کوہ جو پانی کا ہے چشمہ جاری　　نہریں بن بن کے دکھاتا ہے عجب سرشاری
سر ہے اس طرح بدامانِ جبل مار رہا　　سانپ سیماب کا ہو جیسے کہ بل مار رہا
سنگ مرمر کی لبِ آب جو اک سل ہے پڑی　　اُس پہ اک رشکِ پری ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی
رنگ رخ کو گلِ گلزار سے چمکائے ہوئے　　بیٹھی اک پاؤں کو پانی میں ہے لٹکائے ہوئے
اُس پہ ہے چتر کی جا سایہ فگن سبز نہال　　پھول برساتی ہے پہلو میں کھڑی بادِ شمال
نوجوانانِ چمن بزم سجاتے ہیں کھڑے　　فرش گلہائے بہاری کا بچھاتے ہیں کھڑے
سر پہ جو اُس کے دھری ہے کلہ تاجوری　　ہے بجائے دُرِ الماس وہ پھولوں سے بھری
اس کے ہر پھول میں لیکن یہ تماشا ہے الگ　　کہ ہر اک آنکھ کو رنگ اپنا دکھاتا ہے الگ
اُس سے ہر شخص شمیم اپنی جُدا لیتا ہے　　ہر دماغ اُس سے نئے ڈھب کا مزہ لیتا ہے

رُخ جو ہے آئینۂ روئے تمنّا اُس کا	شمع ساں چاروں طرف ایک ہے جلوہ اُس کا
ایک طرف عقل ہے ایک سمت کو تدبیر کھڑی	آگے اِک ساغرِ غفلت لئے تاثیر کھڑی
دیتی ہر دل پر ہے وہ نور سے تنویر جُدا	کامیابی کی دکھاتی ہے وہ تصویر جدا
رکھتی ہے ایسا اثر نرگسِ جادو اُس کی	پڑ رہی دل پہ نظر ہے جو ہر اک سُو اُس کی
ہے ہر اک شخص سمجھتا کہ اشارہ ہے مجھے	تڑپ اُٹھتا ہے ہر اک دل کہ پکارا ہے مجھے
اُس کے دربار میں ہیں شاہ و گدا آئے ہوئے	اپنے دامانِ تمنّا کو ہیں پھیلائے ہوئے
دمبدم ہے جو نسیمِ سحر آتی جاتی	بوئے اُمّید ہے ہر اک کو سُنگھاتی جاتی
دل نے دربار یہ جس وقت دکھایا مجھ کو	اور طلسمات کا عالم نظر آیا مجھ کو
دیر تک دِل رہا تصویرِ تہِ آئینہ	پر جو تہ بات کی تھی فہم میں وہ آئی نہ
غور کی رازِ نہفتہ میں بہت سی میں نے	شجرِ چتر پہ لیکن جو نظر کی میں نے
دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھا ہے ہمائے اقبال	دونوں پر کھولے ہوئے ہے بہوائے اقبال
دیکھتے ہی مجھے یوں بولا بصد خوشحالی	آؤ آزاد تمہاری ہی جگہ تھی خالی
آؤ تم قیدِ تعلق سے ہو آزاد بہت	اپنی وارستگیٔ دل میں ہو تم شاد بہت
آؤ یہاں سایۂ اقبال میں لیویں تم کو	لاؤ کیا آرزوئے دل ہے کہ دیویں تم کو
آؤ اس سایہ میں تم ابر گہر بار ہے یہ	یعنی شاہزادیٔ امّید کا دربار ہے یہ
اُس کے نغمہ سے جو یہ رازِ پُر افسوں نکلا	دل سے بے ساختہ یہ مطلعِ موزوں نکلا
آ کہ آباد ترے دم سے ہے دائم دُنیا	اور مثل ہے کہ بامّید ہے قائم دُنیا
آ کہ ہے تیری ہوا میں دلِ شیدا گلشن	لہلہاتے ہیں تری یاد میں کیا کیا گلشن
دِل کے گلشن پہ ہے چھایا ہوا نیرنگ ترا	کون سا پھول ہے جس پر کہ نہیں رنگ ترا

کون سا دل ہے کہ جس پر نہ چلے دم تیرا
کون انساں ہے خوشی سمجھے نہ جو غم تیرا

کون سا باغ ہے جس میں کہ صبا تیری نہیں
کون سا گل ہے لگی جس کو ہوا تیری نہیں

کون سا دل ہے کہ جس دل میں نہیں چاہ تری
کون سا کوچہ ہے جس میں کہ نہیں راہ تری

تار برقی سے سوا حکم ترا چلتا ہے
دیکھا جس ملک میں واں سکہ ترا چلتا ہے

عہد آئندہ کا میداں ہے اندھیرا بالکل
غیب نے رنگ سیہ جس پہ ہے پھیرا بالکل

اُس میں چلتے تری تدبیر کے ہیں تیر سدا
اُسی میدان میں ہیں پھرتے ترے نخچیر سدا

ذرہ ذرہ سے ترے اُگتے ہیں اشجارِ مراد
خاک میں تیری نظر آتے ہیں گلزارِ مراد

جب ہے کھیتوں میں خزاں آگ لگاتی پھرتی
اور ہوا باغ میں ہے خاک اُڑاتی پھرتی

چشمے خشک اور چمن ہوتے ہیں بے آب پڑے
چاہ بے آب تو ٹوٹے ہوئے دولاب پڑے

پیر دہقاں ہے کہیں بے سروساماں بیٹھا
باغباں خاک پہ حیران و پریشاں بیٹھا

ہوتا اس وقت مصیبت میں نہیں یار کوئی
نہ مددگار کوئی اور نہ غمخوار کوئی

ہاں مگر تو کہ جب اُس وقت میں آجاتی ہے
جلوہ گر باغِ مراد اس کو دکھا جاتی ہے

ابرِ تر سامنے آنکھوں کے لے آتی ہے کبھی
پھلے پھولے اُسے اشجار دکھاتی ہے کبھی

کبھی کھیتوں کو ہرا کر کے دکھا دیتی ہے
کر کے خرمن کبھی انبار لگا دیتی ہے

دمبدم تازہ فسوں آکے سناتی ہے اُسے
باغ سبز ایسا غرض اپنا دکھاتی ہے اُسے

تھا جو مایوس پڑا سینہ و سر باندھ کے وہ
اُٹھ کھڑا ہوتا ہے یکبار کمر باندھ کے وہ

دھوپ میں کھاتا ہے بہاتا ہے پسینا اپنا
کرتا لبریز مرادوں سے ہے سینہ اپنا

ہر مصیبت میں غرض تو ہے سہارا اُس کا
تیری ہی آس پہ ہوتا ہے گذارا اُس کا

اہل ہمت جو ہیں مردانِ تجارت پیشہ
مشغلہ جن کا سیاحت ہے سفر اندیشہ

کوہ و صحرا میں ہیں وہ زادِ سفر باندھے ہوئے
اور چلے جاتے ہیں دن رات کمر باندھے ہوئے

نہ تو پانی کا ہے آرام نہ کھانے کا مزا
اُٹھ گیا اِن کے نصیبوں سے زمانے کا مزا

ہر قدم پر بسرِ راہ خطر ہیں لاکھوں
ایک جوکھوں ہے اگر پاس تو ڈر ہیں لاکھوں

خلشِ خار سے ہے دامنِ دل چاک کبھی
صدمۂ یادِ وطن کرتا ہے غمناک کبھی

دل تو ہے سنگِ مصیبت سے شکستہ اُن کا
اور کسی طرح سے کٹتا نہیں رستہ اُن کا

ہر قدم تُو ہے مگر اُن کی کمر باندھ رہی
سمتِ مقصود پہ ہے تارِ نظر باندھ رہی

حسن انجام منافع کا دکھاتی ہے کہیں
کُرسیاں جاہ و مراتب کی سجاتی ہے کہیں

سامنے جلوۂ اقبال دکھاتی ہے انہیں
اور خزانے کہیں پُر مال دکھاتی ہے انہیں

کامیابی سے کبھی پھر ہے وطن میں لاتی
آبِ رفتہ کو ہے پھر جوئے چمن میں لاتی

طائرِ دل پر پرواز ہیں پھیلائے ہوئے
اور ترا شوق لئے جاتا ہے دوڑائے ہوئے

گرم ہوتا سرِ میداں ہے جو بازارِ ستیز
تیغِ خونبار کہیں اور کہیں خنجرِ خونریز

ہوتی حملوں سے دلیروں کے ہے آفت برپا
عرصۂ جنگ میں ہوتی ہے قیامت برپا

نعرۂ توپ سے شیروں کے ہیں مُنہ مُڑ جاتے
بلکہ ہیں گنبدِ نیلی کے دھوئیں اُڑ جاتے

کہیں خنجر کہیں شمشیر نظر آتی ہے
سامنے موت کی تصویر نظر آتی ہے

پر وہیں معرکۂ جنگ میں ہے تُو آتی
ہاتھ میں ہے لئے اک شیشۂ جادو آتی

ایسا مستِ جامِ جرأت انہیں کر دیتی ہے
بلکہ پیمانۂ دل خون سے بھر دیتی ہے

کہ سرور آنکھوں پہ عینک ہے لگاتا گویا
سیرِ فانوسِ خیالی ہے دکھاتا گویا

دیتی ہے چشمِ تصوّر میں ہر اِک کام دکھا
ہے پھر اُس کام کا دیتی انہیں انجام دکھا

کہ رخِ فتح کبھی دیکھتے ہیں گلناری
زیبِ سر دیکھتے ہیں تاجِ سپہ سالاری

فتحیابی سے کبھی پھیر کے ہے گھر لاتی
پیش لشکر ہے یہ سردارئ لشکر لاتی

شہرتِ عام کے دربار میں لاتی ہے اُنہیں
فخر و اعزاز کی کرسی پہ بٹھاتی ہے اُنہیں

نام پر فتح کے نقارے بجا دیتی ہے
شرق سے غرب تک اک دھوم مچا دیتی ہے

پرچمِ فتح کبھی لاکے ہے لہرا دیتی
فتحیابوں کے ہے سر پہ اُسے جلوہ دیتی

نام اک اک کے نشانوں پہ رقم دیکھتے ہیں
اُن کو اس طرح سے شہرت میں علم دیکھتے ہیں

سیکڑوں دَورِ فلک سر پہ گذر جائینگے
وہ ستارے سے چمکتے ہی نظر آئینگے

دیکھتی چشمِ تصوّر ہے یہ جب باغِ مراد
اور چمک اُٹھتے ہیں سینوں میں جو ہیں داغِ مراد

سر بکف بر سرِ میداں ہیں دلاور آتے
اہل جوہر ہیں دکھاتے ہوئے جوہر آتے

جامِ دل خونِ شجاعت سے چھلک جاتے ہیں
نعرۂ اہلِ وغا تا بہ فلک جاتے ہیں

آتے جانباز جو ہیں سر پہ کفن باندھے ہوئے
اور ہوائیں بسرِ چرخِ کہن باندھے ہوئے

آبِ شمشیر کو شربت کی طرح پیتے ہیں
اور جو مرتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم جیتے ہیں

خوں دلیروں کے ہیں پانی کی طرح بہہ جاتے
اور جگر سینوں میں خوں ہو کے ہیں رہ رہ جاتے

گرم ہوجاتا ہے یہ موت کا بازار وہاں
کہ خریدار پہ گرتا ہے خریدار وہاں

جان و تن موت کے مُنہ کا ہیں نوالا ہوتے
آسماں اور زمیں ہیں تہ و بالا ہوتے

فتحیابی سے بہت چہرے ہیں گلگوں ہوتے
اور بہت تن بسرِ خاک ہیں پُرخوں ہوتے

اے امید ایسے ہزاروں ہیں کرشمے تیرے
یوں ہی بہتے ہیں سدا خون کے چشمے تیرے

ہیں کتب خانۂ ہستی میں بہت صاحبِ علم
اور بہت مدرسۂ دہر میں ہیں طالبِ علم

سوزِ محنت سے بہاتے ہیں پسینے اپنے
حسرتوں سے کئے لبریز ہیں سینے اپنے

نہ تو کھانے کا ہے کچھ فکر نہ پانی کا خیال
ذوق راحت ہے نہ ہے لطف جوانی کا خیال

ہو گئے وصل کتابوں میں ہیں وصلی کی طرح
بلکہ پیوندِ ورق ہیں جُزِ اصلی کی طرح

پھرتے دن بھر ہیں کتابیں لئے سودائی سے
ہاتھ اُٹھا بیٹھے اسی شغل میں بینائی سے

تن کو راحت نہیں اور جان کو آرام نہیں
دن ہو یا رات انہیں محنت کے سوا کام نہیں

روز و شب خونِ جگر اپنا جو کھاتے ہیں وہ
اور بلا بارِ مشقت کی اُٹھاتے ہیں وہ

اِن مصائب کی ہے تو ہی انہیں طاقت دیتی
لطفِ انجام سے ہے حُسن لیاقت دیتی

دیدۂ دل میں لگا دیتی ہے سرمے کیا کیا
دیتی ہے شاہدِ مقصود کو جلوے کیا کیا

اہلِ تصنیف کو ہے عمرِ دوامی دیتی
بادۂ شوق سے ہے عیشِ مدامی دیتی

سطحِ کاغذ پہ تو اک باغ کھلا دیتی ہے
برگ و بار اُس میں مرادوں کے لگا دیتی ہے

عوضِ آب ہے دیتی اُسے تو آبِ حیات
اور دکھا دیتی ہے اس طرح سے شادابِ حیات

شہرہ گلزارِ زمانہ میں رہے عام اُن کا
پتّے پتّے پہ سدا نقش رہے نام اُن کا

کبھی تیار لیاقت کے ہے تمغے کرتی
کہیں ایم اے ہے بناتی کہیں بی اے کرتی

برسرِ کرسیٔ دربار بٹھاتی ہے اُنہیں
خلعتِ بوقلموں لاکے پنھاتی ہے اُنہیں

بزم کو جلوۂ رنگیں ہے دکھاتی اُن کے
اس طرح فخر سے دامن ہے اُڑاتی اُن کے

ہوتے شاداب ہیں دلہائے فسردہ اُن سے
تازہ دم ہوتے ہیں سب کے دلِ مردہ اُن سے

کلفتِ محنت و آفت سے ہیں سب جی جاتے
زہر کے گھونٹ ہیں شربت کی طرح پی جاتے

اک مسافر کہ ہے سرگشتہ و حیراں جاتا
دشتِ پُرخار میں ہے بے سر و ساماں جاتا

نہ کوئی بدرقہ ہے راہ بتانے کے لئے
اور نہ ہے ساتھ کوئی بوجھ بٹانے کے لئے

اس مصیبت میں ستاتی ہے اگر پیاس اسے
رہتی پھر جان کے بچنے کی نہیں آس اُسے

تپشِ راہ سے جلتا ہے جگر سینے میں
بجھ کے رہ جاتا ہے دل مثلِ شرر سینے میں

دفعتہً آبِ رواں دور نظر آتا ہے
اور وہ اس لطف سے لہراتا ہوا جاتا ہے

کہ دلِ سوختہ ہے دیکھ کے لہرا جاتا
اور خوشی سے تنِ بیدم میں ہے دم آجاتا

دل جو تھا لوٹ رہا سینہ میں بے آبی سے
جاتا ہے بے سروپا دوڑتا بےتابی سے

جامِ ہمت جو اُسے تونے ہیں پلوائے ہوئے
کوسوں اک دم میں لئے جاتے ہیں دوڑائے ہوئے

زورِ ہمت ہے مگر جتنا بڑھاتے جاتے
اُتنا ہی آگے ہے پانی کو ہٹاتے جاتے

یاس اُس وقت کی لیکن نہ خدا دکھلائے
دلِ مایوس کو جب اُس کا یقیں آجائے

کہ جسے آب سمجھتا ہے نہیں آب ہے یہ
بلکہ گردابِ فنا اے دلِ بیتاب ہے یہ

یہ سمجھتے ہی اندھیرا ہو جہاں آنکھوں میں
ہوں وہیں موت کے آثار عیاں آنکھوں میں

دل میں ہمت نہ رہے جسم میں حالت نہ رہے
صورتِ نقشِ قدم ہلنے کی طاقت نہ رہے

جان پانی میں ہو اٹکی ہوئی دم سینے میں
وہ بھی پرضعف سے آکر رہے تھم سینے میں

اُس گھڑی اپنی کرامات دکھاتی ہے تو
سرِ بالیں وہ مسافر کوئی لاتی ہے تو

حضرتِ خضر کی ہے شان دکھاتا آتا
ہاتھ میں پانی کی چھاگل ہے ہلاتا آتا

اُس کے آجانے سے ہوتی ہے نجات اُسکے لئے
ہوتا ہے قطرۂ آب آبِ حیات اُسکے لئے

کرتے زاہد جو خدا کی ہیں عبادت دن رات
ترکِ دنیا سے ہیں سرگرمِ ریاضت دن رات

ذکرِ فردوس میں تونے اُنہیں سنوائے ہوئے
لطف ہر دم ہیں وہی پیش نظر آئے ہوئے

رندِ آزاد جو ہر دم ہے گرفتارِ گناہ
بارِ عصیاں سے ہے بیچارہ گرانبارِ گناہ

نہیں جُز رحمتِ حق کوئی سہارا اُس کا
تیری ہی چشمِ کرم پر ہے گذارا اُس کا

تو نہ ہووے تو تڑپ کر دلِ مضطر رہ جاے
وہ گنہگار تو غم سے ابھی مر کر رہ جاے

رکھتے ہیں شعر و سخن سے جو سروکار سدا
کارِ اربابِ جہاں سے ہیں وہ بیزار سدا

ہے شب تار تو سونے سے اُنہیں کام نہیں
دن کو جز فکرِ مضامیں کبھی آرام نہیں

لوگ آرام سے ہیں رات کو سویا کرتے
اور یہ بیٹھے دُرِ مضموں ہیں پرویا کرتے

یہ جو ہر لطف سے ہیں ہاتھ اُٹھائے بیٹھے
یا کہ دیوانوں کی صورت ہیں بنائے بیٹھے

باغِ سبز اپنے تو ہر لحظہ دکھاتی ہے اُنہیں
مژدۂ خلعت و انعام سُناتی ہے انہیں

اُنہیں مطلب نہیں پر اور کسی بات سے ہے
ہاں غرض ہے تو فقط اتنی تری ذات سے ہے

کہ جو آہ اُن کے دلِ سوختہ جاں سے نکلے
یا کوئی نالۂ موزوں کہ زباں سے نکلے

اثرِ درد سے ناخن بہ جگر ہووے سدا
اور جگر درد سے لبریز اثر ہووے سدا

ہووے اس پر بھی جو آشوب جہاں حد سے زیاد
قول آزاد سے کرتی ہے انہیں یوں ارشاد

کہ سخن فہم تہِ چرخِ بریں ہوئینگے
خوردہ بیں ہیں تو سخنداں بھی یہیں ہوئینگے

داد مل جائیگی جب اور کوئی دیکھیگا
آج دیکھا نہ کسی نے تو کبھی دیکھیگا

حُبِّ وطن

ہے قول جملہ تجربہ کارانِ فارسی
اور کہتے ہیں یہ نظم نگارانِ فارسی

حُبِّ وطن ز ملکِ سلیماں نکوتر است
خارِ وطن ز سنبل و ریحاں نکوتر است

سلطانِ دل کا گرچہ یہی حُکمِ عام ہے
اور متفق اسی پہ زمانہ تمام ہے

پر ملکِ مصلحت کا ہے کچھ انتظام اَور
اس سلطنت کو چاہیئے طرزِ نظام اَور

حبِّ وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے
نکلے جو گل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے

حبِّ وطن نہ یہ ہے کہ پانی میں گر نہ ہو
ماہی کی زندگی کسی صورت بسر نہ ہو

یا ہو گھر جو لوٹتا دریا کی یاد میں
داخل ہو وہ بھی زمرۂ اہلِ وداد میں

حبّ وطن اسے بھی نہیں کہتے اہلِ دید
آرام جان و تن کو جو سمجھیں گھروں میں عید

آبِ خنک ہو سامنے اور نانِ گرم ہو
اور وقتِ خواب فرش بھی سونے کو نرم ہو

یہ الفتِ وطن نہیں ہرگز کہ باغ میں
سودا پکائے بلبلِ شیدا دماغ میں

آخر شکارِ دام ہو گلشن کو چھوڑ کر
یادِ چمن میں جان دے سر پھوڑ پھوڑ کر

حُبّ وطن اسے بھی نہیں کہتے اہلِ ہوش
یادِ وطن میں ہووے گہے جوش و گہ خروش

بچوں کی طرح روتے سدا زار زار ہوں
اور مادر و پدر کے لئے بے قرار ہوں

اہل و عیال کا نہ گوارا فراق ہو
اور یار کا فراق بہت دل پہ شاق ہو

حب وطن اسے نہیں کہتے کہ گھر رہیں
بچوں کے مُنہ کو چومتے آٹھوں پہر رہیں

ہے کوئی گود میں کوئی گردن کا ہار ہے
بی بی کہیں میاں کو بہت مجھ سے پیار ہے

روئیں سفر میں دوست گہے یار کے لئے
اور گاہ سیر کوچہ و بازار کے لئے

اے دوست یہ تو دوستیٔ سنگ و خشت ہے
یہ دوستی تو خوب نہیں بلکہ زشت ہے

آیا یہ دھیان آج جو وقتِ سحر مجھے
اِک نقل یاد آگئی اس اصل پر مجھے

دلّی کہ جو ہمیشہ سے کانِ کمال ہے
جو با کمال اس میں ہے وہ بے مثال ہے

اِک شخص واں ستار نوازی کی جان تھا
پر جان سے عزیز تھا دلّی کو جانتا

آیا دکن سے خلعت و زر اُس کے واسطے
اور نقد بہرِ زادِ سفر اُس کے واسطے

ہر چند مُنہ تو دلّی سے موڑا نہ جاتا تھا
پر ہاتھ سے یہ مال بھی چھوڑا نہ جاتا تھا

مطلب یہ ہے کہ بعد بہت قیل و قال کے
اسباب سارا راہِ سفر کا سنبھال کے

دلّی کو یہ بھی چھوڑ کے سوئے دکن چلے
پر جیسے چھوڑ کر کوئی بلبل چمن چلے

پہنچے مگر ابھی تھے درِ راج گھاٹ پر
جو دفعتہً نظر پڑی دریا کے پاٹ پر

دریا کی لہریں دیکھ کے لہرایا ان کا دل
اور دلی چھوڑتے ہوئے بھر آیا انکا دل

مُنہ پھیر کر نگاہ جو ہیں شہر پر پڑی
جلوہ دکھاتے جامع مسجد نظر پڑی

تب وہ پیام بر کہ جو آیا دکن سے تھا
اور ان کو لے چلا وہ چھڑا کر وطن سے تھا

دیکھا نگاہِ یاس سے اور اس سے یہ کہا
پیچھے چلینگے پہلے مگر یہ تو دو بتا

ایسی تمہارے شہر میں جمنا ہے یا نہیں
مُنہ دیکھ کر وہ ان کا ہنسا اور کہا نہیں

پھر سوئے شہر اشارہ کیا اور یہ کہا
مسجد بھی اس طرح کی دکھا دو گے واں بھلا

وہ شخص مسکرایا کہ یہ کیا سوال ہے
اس خانۂ خدا کا تو ثانی محال ہے

ہے اپنے طرز میں یہ نرالی جہان سے
اُتری زمیں پہ جس کی شبیہ آسمان سے

یہ بات اُسکی سُنتے ہی چیں بر جبیں ہوئے
اور بولے خیر ہے کہ روانہ نہیں ہوئے

جمنا نہیں ہے جامع مسجد جہاں نہیں
سُنتے بھی ہو میاں ہمیں جانا وہاں نہیں

اپنے دکن کو آپ روانہ شتاب ہوں
پر اس چمن کو چھوڑ کے ہم کیوں خراب ہوں

اور گاڑی اپنی تو بھی میاں گاڑی بان پھیر
گر اب پھرے نہ یاں سے تو قسمت کا جان پھیر

ہم اپنی دلی چھوڑ دکن کو نہ جائینگے
گریاں بہت نہ کھائینگے تھوڑا ہی کھائینگے

ایسے ہی ننگ حبِ وطن بدنصیب ہیں
گھر میں مسافروں سے جو بدتر غریب ہیں

کتنے ہیں دُکھ اُٹھانا ہو یا درد سہنا ہو
تھوڑا سا کھانا ہو پہ بنارس میں رہنا ہو

اب میں تمہیں بتاؤں کہ حبِ وطن ہے کیا
وہ کیا چمن ہے اور وہ ہوائے چمن ہے کیا

وہ رحمتِ خدا کہ جو بندوں پہ عام ہے
وہ لطف عام جس سے جہاں شاد کام ہے

وہ نورِ مہر جس سے زمانے میں نور ہے
وہ نور ذرّہ ذرّہ پہ جس کا ظہور ہے

حب وطن ہے جلوہ اُسی نور پاک کا ‌ ‌ ‌ اور روشن اُس کے نور سے عالم ہے خاک کا
ہو مہر میں یہ نور تو اس کو کرن کہیں ‌ ‌ ‌ گر دل سے جلوہ گر ہو تو حب وطن کہیں
رکھتا جو سب پہ لطف و کرم کی نگاہ ہو ‌ ‌ ‌ اور دل سے ہر بشر کے لئے خیر خواہ ہو
آوارۂ سفر ہو کہ موجود گھر میں ہو ‌ ‌ ‌ ہاتھ اپنا جیب نفع میں ہو یا ضرر میں ہو
ہر حال میں رہیں اُسے اہلِ وطن عزیز ‌ ‌ ‌ اور ہوویں نیک و بد روش جان و تن عزیز
حب وطن کے ملک میں فرماں روا ہے وہ ‌ ‌ ‌ تاج و سریر ہو کہ نہ ہو بادشا ہے وہ
اور حب وطن کی چاہ تھی یوسف کے سینے میں ‌ ‌ ‌ اس کا تو نقش دیکھ لو دل کے نگینے میں
لیکن یہ راز اہل حقیقت سے پوچھئے ‌ ‌ ‌ اس کا طریق پیر طریقت سے پوچھئے
دل جو گھڑی کی طرح برابر ہے چل رہا ‌ ‌ ‌ ہر دم وطن کی سمت ہے منزل بدل رہا
حب الوطن کی راہ میں گرم نفس ہے یہ ‌ ‌ ‌ نالاں غم فراق سے مثل جرس ہے یہ
یعنی کہ پاؤں اپنے وطن کا پتہ کہاں ‌ ‌ ‌ بلبل تھا کس چمن کا ہیں اور آپھنسا کہاں
جنت سے آئے آدم و حوّا زمیں پہ تھے ‌ ‌ ‌ رکھتے جو قبضہ گلشنِ خلدِ بریں پہ تھے
میراث اپنی گلشن جنت کا باغ ہے ‌ ‌ ‌ حق ہے اگر فراق سے دل داغ داغ ہے
پر آفریں ہے حضرتِ انساں کی ذات کو ‌ ‌ ‌ بھولے نہیں ہیں آج تلک اپنی بات کو
لیتے وطن پہ قبضہ ہیں دے دے کے جاں تلک ‌ ‌ ‌ آخر پہنچ ہی رہتے ہیں باغِ جناں تلک
آزاد خیر ہے کدھر آیا خیال ہے ‌ ‌ ‌ تم دیتے کیا جواب ہو اور کیا سوال ہے
جاتا تھا کس طرف کو قدم جا پڑا کہاں ‌ ‌ ‌ تھا ذہن کس خیال میں اور جا لڑا کہاں
دنیا زبس کہ مزرع عقبےٰ تمام ہے ‌ ‌ ‌ سرسبز کرنا اس میں بھی لازم کلام ہے
لکھتے ہیں اس طرح سے مورخ فرنگ کے ‌ ‌ ‌ دانا رموز معرکۂ صلح و جنگ کے

یعنی یورپ کے ملک میں دو تاجدار تھے
دونوں کے اہل ملک مگر جاں نثار تھے

سرحد پہ کچھ فساد تھا پر ایسا پڑ گیا
دونوں کے اتفاق کا نقشہ بگڑ گیا

آخر کو تھے جو واقفِ اسرارِ سلطنت
سمجھے بہم یہ مصلحت کار سلطنت

دو جاں نثارِ ملک روانہ اُدھر کریں
اور اپنے دو اِدھر کو وہ گرم سفر کریں

تا چاروں جس جگہ کہ بہم ایک بار ہوں
سرحدِ مُلک کے وہیں قائم منار ہوں

جاں باز اس طرف کے مگر جان توڑ کر
ایسے اُڑے کہ پیچھے ہوا کو بھی چھوڑ کر

اک حصہ طے نہ رستہ حریفوں نے تھا کیا
یہ تین حصہ بڑھ گئے اور اُن کو جا لیا

لیکن حریف شرط کے میداں کو چھوڑ کے
بولے یہ عہدِ قول و قرار اپنا توڑ کے

دو اپنے اپنے ملک کے جو جاں نثار ہوں
پھر اب کے دو طرف سے رواں ایکبار ہوں

پر اپنی بات پہلے ہر اک شخص جان لے
اور یہ ارادہ خوب طرح دل میں ٹھان لے

یعنی جو شرط جیت کے خورسند ہوئیگا
سرحد پہ وہ زمین کا پیوند ہوئیگا

جانباز آئے تھے جو ابھی راہ مار کے
حب الوطن کے جوش سے بولے پکار کے

جو شرط اب لگائی ہے تم نے یہی سہی
اور بات جو کہ ہونی ہے پھر وہ ابھی سہی

پر بیچ میں نہ حیلہ حوالہ کی آڑ دو
سرحد ہماری ہو چکی بس ہم کو گاڑ دو

حاصل یہ ہے کہ دونوں اُسی جا پہ اڑ گئے
جیتے کے جیتے ملک کی سرحد پہ گڑ گئے

اور ہے لکھا مورخِ عہدِ قدیم نے
روما پہ کی جو فوج کشی اک غنیم نے

تیار اہل فوج پئے کارزار تھے
پر اہل ملک اُن سے سوا جاں نثار تھے

آیا حریف جبکہ نہایت قریب شہر
اُٹھے برائے جنگ امیر و غریب شہر

پر اُن میں کوکلیز جو مردِ دلیر تھا
حب الوطن کے حق میں نیستاں کا شیر تھا

نکلا وہ سج کے اسلحہ جنگ شہر سے
اور لشکر عدو کی طرف آیا قہر سے

دو جاں نثار حب وطن اَوْر ساتھ تھے
اعدا کے خوں میں ڈوبے سدا جنکے ہاتھ تھے

ہے جیسا بحر گنگ کا مائی لقب یہاں
تھے ٹائی بر کو باپ کہا کرتے سب وہاں

وہ بحر نیچے شہر کے تھا اوج موج پر
پل سے اُتر کے آئے یہ دشمن کی فوج پر

پُل کا دہانہ روک کے تیغوں کے گھاٹ سے
اعدا کے خوں بہاتے رہے کاٹ کاٹ کے

اور اپنی فوج کو یہ پکارے کہ آؤ تم
حملہ تو ہم نے روک لیا پُل گراؤ تم

مسمار اُدھر وہ کرتے رہے پُل کو آن کر
یہ تیر و نیزے مارے گئے تان تان کر

پُل سارا ٹوٹ ٹوٹ کے دریا میں بہہ گیا
ایک آدمی کا راہ گذر جبکہ رہ گیا

تب کوکلیز یاروں سے بولا کہ جاؤ تم
اے میرے پیارے ہموطنو غم نہ کھاؤ تم

قسمت میں جو لکھا ہو سو ہو۔ چھوڑ دو مجھے
تم جاؤ اور خدا کے حوالے کرو مجھے

اک اک رفیق جبکہ ادھر پار ہو گیا
اور پُل جو کچھ رہا تھا وہ مسمار ہو گیا

للکارا پہلے دشمنوں کو دھوم دھام سے
اور ٹائی بر میں کہ کے یہ کودا دھڑام سے

ٹالا ہے تو نے سر سے عدو کی تباہی کو
اے میرے باپ لیجیو اپنے سپاہی کو

دشمن کی فوج تیغیں سنبھالے ہی رہ گئی
اور موت اپنے دانت نکالے ہی رہ گئی

دیکھو تو فیض حب وطن اس کو کیا ملا
جھٹ چار ہاتھ مار کے یاروں میں جا ملا

گر اس ہوا میں رکھتے ہو دلِ لالہ زار تم
اور ہو بہ تیغ حب وطن دلفگار تم

ایرانیوں کے عہد کیانی کو دیکھ لو
اس بحر سلطنت کی روانی کو دیکھ لو

کیا کیا مخالفوں سے بچایا ہے ملک کو
کیا کیا عروج دے کے بڑھایا ہے ملک کو

کیا کیا خجل کیا ہے سپہرِ بنفش کو
کیا کیا شکوہ دی ہے کیانی درفش کو

اعدا کے خوں سے تیغیں ہیں کیا آبدار کیں
کیا کیا وطن کے نام پہ جانیں نثار کیں

ان میں بھی سیستاں کے بہادر وہ شیر تھے
جن سے کہ اک جہاں کے زبردست زیر تھے

کرتے تھے عیش دامن کہسار میں کبھی
اور لوٹتے تھے سبزۂ گلزار میں کبھی

مثلِ غزال دشت میں کرتے کلیل تھے
جنگِ پلنگ و شیر انہیں بچوں کے کھیل تھے

آبِ رواں پہ لیتے بہاروں کے لطف تھے
تیر و کماں سے لیتے شکاروں کے لطف تھے

پر سنتے جب کہ شاہ بعزمِ غنیم ہے
یا یہ کہ اپنے ملک کی حالت سقیم ہے

درد و الم میں ہوں کہ نشاط و سرور میں
ہوں گھر میں یا کہ وادیٔ نزدیک و دور میں

جس حال میں ہوں بے سر و پا اُٹھ کے دوڑتے
روئے زمیں سے مثلِ ہوا اُٹھ کے دوڑتے

اور ان میں شان رستمِ دستاں کی دیکھئے
الفت وطن سے شیر نیستاں کی دیکھئے

وہ جس طرف بپھر کے بہ شکلِ بلا چلا
بولی زمیں لرز کے کدھر زلزلہ چلا

وہ گرز گاو سر کو دھرے قاش زین پر
لنگر کا جس کے صدمہ ہو گاوِ زمین پر

ریش دوشاخ دوشِ ہوا پر اُڑی ہوئی
افعی کے پیچ و خم میں وہ موچھیں مُڑی ہوئی

فولاد کا وہ خود جو کلّہ تھا شیر کا
کرتا فزوں تھا دبدبہ گردِ دلیر کا

بر میں وہ چرمِ شیر کا خفتاں پھنسا ہوا
اور پائے عزم نافِ زمیں میں دھنسا ہوا

پاکھر پڑی وہ رخش پہ چیتے کی کھال کی
اور دوش پر شکوہ وہ گینڈے کی ڈھال کی

جانا چھڑانے شاہ کو مازندران میں
لڑنا وہ دیو دد سے رہِ ہفتخوان میں

وہ بار بار معرکے افراسیاب سے
ہونا ہمیشہ سینہ سپر انقلاب سے

جب گرم کارزار ہوا خوں بہا دئے
اور دشمنوں کے خوں سے جیحوں بہا دئے

وہ سیستاں کا شیر عجب کام کر گیا
حب الوطن کے معرکہ میں نام کر گیا

ہر چند شہرہ خلق میں رستم کا عام ہے
اور لیتا آج تک بھی ہر اک اس کا نام ہے

پر جو وہاں دلاور فرخندہ کام تھے
حب الوطن کے رستم و دستان و سام تھے

جب سنتے تھے کہ شاہ کہیں گرم جنگ ہے
یا جنگ سے وطن پہ ہوا عرصہ تنگ ہے

سوتے ہوں یا کہ بیٹھے ہوں یا مست خواب ہوں
یا شوق میں شکار کے پا در رکاب ہوں

حب الوطن کے جوش میں ہر کام چھوڑ کر
چاروں طرف سے دوڑتے تھے جان توڑ کر

اور معرکہ میں جنگ کے پھر جوش عزم میں
گرز و کمند و تیغ سے میدان رزم میں

لڑتے تھے اور مرتے تھے اور جان کھوتے تھے
اپنے وطن کے نام پہ قربان ہوتے تھے

میدان جنگ جیتے ہمت کے داؤں میں
لاتے تھے اپنے شاہ کو تیغوں کی چھاؤں میں

چہروں کو رنگ دے کے گل نوبہار سے
جاتے تھے گھر کو معرکۂ کارزار سے

حب الوطن ہے نور میں ہمنور آفتاب
اور کرتا ہے ظہور بدستور آفتاب

اس کا بھی روز و شب کی طرح ہیر پھیر ہے
اک جا جو روشنی ہے تو اک جا اندھیر ہے

آج اس کا آفتاب ہے اوج فرنگ پر
اور رات ہند کی ہے رخ تیرہ رنگ پر

ہے کچھ حساب اور وہاں کی کتاب کا
رکھتا ورق ورق ہے نشاں آفتاب کا

جانباز ہیں تو بہر وطن جاں نثار ہیں
اور تیغ عزم رکھتے سدا آبدار ہیں

قائم ہو تا کہ دبدبہ اہل غرور پر
اور بیٹھے سکہ ملک کا نزدیک و دور پر

وہ مال کچھ سمجھتے نہیں نقد و جان کو
دیتے ہیں شان اپنے وطن کے نشان کو

عالم جو علم و فضل کے ہیں جوہری بہت
ہیں دل میں رکھتے مایۂ دانشوری بہت

ٹپکاتے کوششوں کے پسینے جبیں سے ہیں
اور قطرہ قطرہ کرتے بہم ہر کہیں سے ہیں

تا ہو پئے سراب وطن آب جو نصیب
اپنے وطن کے واسطے ہو آبرو نصیب

شایستگی کے ساتھ رواجِ کمال ہو
علم و ہنر میں اپنا وطن بے مثال ہو

تاجر کہ وہ بھی عقل کے سرمایہ دار ہیں
ہر چند فکر مال میں لیل و نہار ہیں

کھوتے وطن کے نام پہ ہیں مال و جان کو
طے کرتے ہیں بہ پائے سیاحت جہان کو

لیکن نہ یاد گھر ہے نہ ہے فکرِ زر انہیں
حب الوطن ہی نقش ہے پیش نظر انہیں

کرتے ہیں دانہ دانہ بہم خوشے خوشے سے
اور ذرہ ذرہ ڈھونڈتے ہیں گوشے گوشے سے

چُنتے ہیں ساتھ مال کے علم و ہنر کے پھول
تا گلشنِ وطن میں کھلیں سیم و زر کے پھول

دولت کا ہو شگفتہ وطن میں چمن سدا
اور اُس سے بہرہ یاب ہوں اہلِ وطن سدا

ایسے بھی اُن میں صاحبِ بخت و نصیب ہیں
دار الشفائے حب وطن میں طبیب ہیں

عالم میں بہر تجربہ پھرتے ہیں گشت کو
اک اک قدم میں ناپتے وہ کوہ و دشت کو

ہیں ذرہ ذرہ چھانتے دریا و کان کا
ہیں برگ برگ دیکھتے باغِ جہان کا

ہیں گاہ ڈال ڈال میں گہ پات پات میں
ہے غور بات بات کی ذات و صفات میں

اِک اِک ورق میں صورت تحریر دیکھتے
اور اس میں برگ برگ کی تاثیر دیکھتے

تا نکلے کوئی تازہ مداوا گزند کا
اور ہو دوائے درد کسی دردمند کا

پران میں وہ ہے زینتِ تاج و نگیں سدا
اور زیب سر ہیں اُس کے گلِ آفریں سدا

لایا ہو بحر و بر کے سفر کو نہ دھیان میں
آیا وطن کو چھوڑ کے ہندوستان میں

فرخ سیر تھا ہند میں فرمانروائے ملک
اور غیرتِ نسیم و صبا تھی ہوائے ملک

پر ہند پر تھا حادثۂ غم عجب پڑا
یعنی کہ بادشاہ تھا خود جاں بلب پڑا

اس طرح کا فتور پڑا تھا مزاج میں
تھا مبتلا وہ ایک مرضِ لاعلاج میں

سب اہلِ عقل ہوش و حواس اپنے کھو چکے
سارے طبیب ہاتھ علاجوں سے دھو چکے

خوابِ امن

تھک کے خورشید نے دم کل جو سرِ شام لیا
دل نے بھی کرسیٔ آرام پہ آرام لیا

میں کہ دن بھر کی مصیبت سے تھکا ماندہ تھا
مکتبِ دیدہ کا پر شائقِ ناخواندہ تھا

دمبدم دورِ فلک تازہ سبق تھے گویا
رات دن مجھ کو زمانہ کے ورق تھے گویا

شبنمِ امن و اماں سے کبھی شاداب جہاں
اور کبھی شعلۂ آفات سے بیتاب جہاں

بود نابود جو نظروں میں تُلے جاتے تھے
معنیٔ کون و فساد اُسمیں کھُلے جاتے تھے

دفعتاً سامنے لیلائے شبِ تار آئی
کرتی اک اک کو مئے شوق سے سرشار آئی

گرچہ لائی تھی نہ سامان مے و مینوشی کا
ہاتھ میں شیشہ تھا پر دارُوے بیہوشی کا

چال سے سرمۂ حیرت کے غبار اُڑتے تھے
حال سے دیدۂ غفلت کے خمار اُڑتے تھے

ایسے انداز سے دامن تھی ہلاتی آتی
سب کو تھی امن کے سائے میں سُلاتی آتی

اُس کا جھوکا ہوا غفلت کا حجاب آنکھوں پر
خوابِ شیریں نے کیا کار نقاب آنکھوں پہ

خواب گو کارِ جہاں میں خلل انداز ہوا
پرِ خیالاتِ دلی کو پرِ پرواز ہوا

ذوقِ گلگشت کا اک دے کے اشارہ مجھ کو
ایسے گلزاروں میں لے جا کے اُتارا مجھ کو

کہ نہ تھا فصلِ بہاری پہ سہارا اُن کا
تھا چمن بندِ طبیعت چمن آرا اُن کا

اُس قلمرو میں رواں تھا قلمِ امن و اماں
پتے پتے کے ورق پر رقمِ امن و اماں

پانی نہروں میں پڑا بہتا تھا اور شور نہ تھا
موجیں بھی دست و گریباں تھیں مگر زور نہ تھا

سرکشی سروِ سرافراز دکھاتے ہی نہ تھے
سینہ زوری کے بگولے اُدھر آتے ہی نہ تھے

زلفِ سنبل کی سیہ تھی پہ سیاہ کار نہ تھی
خم تو تھے اُس میں مگر پیچ سے خمدار نہ تھی

سرِ شمشاد کا طرّہ وہاں طرّار نہ تھا — شوخیٔ چشم سے نرگس کو سروکار نہ تھا
دھوپ کا رنگ جو گھٹتا تھا تو ٹل جاتی تھی — اور نسیم آکے دبے پاؤں نکل جاتی تھی
صبح بیتاب نہ رکھتی تھی کہ دم مار سکے — یا صبا پاؤں کی آہٹ سے قدم مار سکے
پر جب آتی تو شگوفہ بھی نیا لاتی تھی — ایسا کچھ پھونک کے کانوں میں چلی جاتی تھی
ہنستے تھے پھول پہ کھلتے گرہِ راز نہ تھی — لوٹ جاتی تھی نکلتی مگر آواز نہ تھی
مرغ واں نغمۂ بے صوت و صدا گاتے تھے — اور شجر موجِ ہوا میں پڑے لہراتے تھے
برگ سے برگ و لیکن نہ کھڑک سکتا تھا — خار کی نوک میں دامن نہ اٹک سکتا تھا
لوریاں دیتے تھے نغموں میں پرندے سارے — سوتے آرام سے تھے عیش کے بندے سارے
باغباں قدرتِ حق کا تھا جو آیا اُس جا — تختہ اک تھا گلِ خود رَو کا لگایا اُس جا
دامنِ کوہ سے چشمہ جو ہوا تھا جاری — آبِ شیریں سے پڑا کرتا تھا شیریں کاری
اس پہ جھرمٹ میں درختوں کے لبِ جو کی بہار — اور لبِ جو پہ وہیں سبزۂ خود رَو کی بہار
شیر بکری وہاں اک گھاٹ پہ تھے پانی پیتے — جامِ الفت تھے بہم دشمنِ جانی پیتے
جلوہ گر بیچ میں ایک قلعہ شاہنشاہی — گنبدِ امن تھا یا گنبدِ بسم اللّٰہی
در و درباں کی ضرورت تھی نہ زنہار وہاں — پاسباں امن کا تھا دن رات ہشیار وہاں

خسروِ امن کا دربار

میں کہ آشوبِ جہاں سے تھا ستم دیدہ بہت — امن کو سمجھا غنیمت دلِ غمدیدہ بہت
شوقِ دل لے کے غرض قصر میں آیا مجھ کو — پر عجب عالمِ نیرنگ دکھایا مجھ کو
خسروِ امن تھا واں جلوہ فزائے دربار — دیتی فرحت تھی دل و جاں کو ہوائے دربار
اُس کے آگے تھا مرادوں کا چمن پھول رہا — آپ تھا پھولوں کے جھولے میں پڑا جھول رہا

نیند کا جھوکا تھا جھولے کو جُھلاتا جاتا
مورچھل سر پہ تھا آرام ہلاتا جاتا

گل خورشید تھا واں ہر گلِ شاداب سدا
دھوپ کی جا تھی مگر چادرِ مہتاب سدا

صبح دن رات کھڑی سامنے ہنستی تھی وہاں
نور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وہاں

ہاتھ باندھے تھیں مرادیں وہیں ہر دم آگے
آرزوئیں تھیں کھڑی ناچتی چھم چھم آگے

دولت و عیش طرب تھے امرائے دربار
کرتے تھے نظم و نسق جملہ برائے دربار

دل میں افکار پریشاں کا نہ تھا نام وہاں
ہاتھ جمعیتِ خاطر کے تھے سب کام وہاں

مرغزاروں میں جو اشجار تھے سب چھائے ہوئے
دامن امن و اماں خلق پہ پھیلائے ہوئے

شغل میں اپنے ہر اک شخص تھا مشغول وہاں
چنتا تھا راحت و آرام کے پھل پھول وہاں

عِلم امن کا شکریہ کرتا ہے

دفعتاً دیکھا کہ ایک پیر کہن سال آئے
پر عجب شان سے وہ مرد خوش اعمال آئے

جسمِ پر نور میں پہنے ہوئے جامہ کالا
بَر میں جبّہ عربی سر پہ عمامہ کالا

پاؤں تک شملہ دستار جو آجاتا تھا
اُن کی مقدارِ فضیلت کو بتا جاتا تھا

لاغری چہرے پہ ہر چند کہ چھائی تھی بہت
رخ کی عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت

شانہ تھا ریش مقدس میں کیا پیری نے
اور جُھکایا تھا بڑھاپے کی زمیں گیری نے

ساتھ کُچھ لوگ کتابیں تھے اُٹھائے آتے
اور بغل میں کئی جزدان دبائے آتے

سب کی سب پیچھے بہ صد صدق و صفا آتے تھے
ٹیکتے آپ کرامت کا عصا آتے تھے

الغرض بادشہِ امن کے آگے آئے
پہلے سب نے بہ ادب دستِ دعا پھیلائے

پھر یہ کی عرض کہ آئے ہیں وکالت کے لئے
علم نے بھیجا ہے تقدیمِ رسالت کے لئے

اہل تصنیف ہیں تصنیف میں مصروف سدا
ہے ہر اک شہرتِ تعریف میں معروف سدا

اہل تحصیل کو پڑھنے کے سوا کام نہیں
اور جہاں میں اُنھیں فکرِ سحر و شام نہیں

دمبدم علم ہے کرتا عمل ایجاد نئے
آتے ہیں کارگہ دہر میں اُستاد نئے

درس و تدریس کے چرچے جو ہیں گھر گھر جاری
ہیں یہ جمعیّتِ خاطر کی ہی باتیں ساری

جو ہمیں چاہئیں موجود ہیں سارے ساماں
ملتے ہیں پہلے ضرورت سے ہمارے ساماں

اے شہ امن یہ سب فیض کرم تیرے ہیں
کشورِ علم میں سب بھر رہے دم تیرے ہیں

تو نہ ہووے تو ابھی خلق میں طوفاں ہو جائے
سب کا شیرازۂ اوراق پریشاں ہو جائے

زراعت شکریہ کرتی ہے

تھا انھوں نے ابھی دفتر نہ سمیٹا اپنا
اور نہ تھا علم نے طومار لپیٹا اپنا

دیکھا انبوہ ہے اک سب سے زیادہ آتا
ہے سوار اُن میں کوئی کوئی پیادہ آتا

گھوڑیاں آگے سواری ہیں بچھیرے پیچھے
اور کئی بیل لئے آتے ہیں گھیرے پیچھے

گود میں ہے کوئی گوسالہ اُٹھائے آتا
کوئی ہل اپنا بغل میں ہے دبائے آتا

نذر کے ٹوکرے کندھوں پہ دھرے آتے ہیں
نئی فصلوں کے اناج انہیں بھرے لاتے ہیں

طرّے اعزاز کے جن لوگوں نے ہیں پائے ہوئے
بالیں گیہوں کی وہ پگڑی میں ہیں لٹکائے ہوئے

ہمت و عزم میں تو بڈھے بھی جواں ہیں اُنکے
تندرستی کے نشاں مُنہ پہ عیاں ہیں اُنکے

دیکھ اُنہیں سب علما ہٹ کے کنارے آئے
بے تکلف سرِ دربار وہ سارے آئے

اور کہا سب نے کہ اے بادشہِ امن واماں
تجھ سے جاری ہے زمانے میں رہِ امن و اماں

کر کے طے گھر سے بہت فرسخ و میل آئے ہیں
جانب اہلِ زراعت سے وکیل آئے ہیں

کہ وہ صحرا میں جو ہیں بیٹھے سہارے تیرے
آسرے رکھتے ہیں دن رات بچارے تیرے

کھیت پر بیٹھے ہوئے ہیں تو دعا کرتے ہیں *
گھر میں ہیں تو ترے شکرانے ادا کرتے ہیں

* تو رہ نیساں ہے کہ جس کھیت پہ آجاتا ہے
خاک پر آب زمرد کی ہوا جاتا ہے

سایۂ امن ترا اُس کو ہرا رکھتا ہے
صرصرِ فتنہ سے محفوظ سدا رکھتا ہے

تو بچاتا ہے زمانے کی لگدکوبی سے
ترکتازانِ حوادث کی پرآشوبی سے

فیضِ رحمت ترا ہر لحظہ بڑھاتا ہے اُسے
زور تیرا ہے کہ زر کر کے اُٹھاتا ہے اُسے

کرتا خرمن ہے تو ہی بکھرے ہوئے دانوں کو
تو ہی اک دانہ سے ہے پالتا سو جانوں کو

تو نہ ہووے تو ہرے کھیت ہوں پامال تمام
دم میں ہو خلقِ خدا کال سے بدحال تمام

تجارت شکریہ کرتی ہے

سخن ان کا نہ سرِ خاتمہ آیا تھا ابھی
اور زراعت نے یہ خرمن نہ اُٹھایا تھا ابھی

لوگ کچھ اور بھی آئے پئے تقریر وہاں
دشت و دریا کی لگے کھینچنے تصویر وہاں

گرچہ حال اپنا زباں سے نہ بتلاتے تھے وہ سب
مگر انداز سے ایسے نظر آتے تھے وہ سب

کہ ابھی قطع کئے راہِ سفر آئے ہیں
ریل سے یا کہ جہازوں سے اُتر آئے ہیں

تھا کوئی دوش پہ خورجین اُٹھائے آتا
اور بغل میں کوئی بیگ اپنا دبائے آتا

رنگ سنولائے ہوئے چہرے تھے گرد آلودہ
دل تھے کلفت زدہ اور سینے تھے درد آلودہ

دشت و دریا کے عجائب تھے وہ ہمراہ لئے
تحفے ہر ملک کے ہاتھوں میں پئے شاہ لئے

خسروِ امن کے دربار میں جب آئے وہ
بعدِ آداب زباں پر یہ سخن لائے وہ

اے شہِ امن دعا خلقِ خدا کرتی ہے
اور تجارت ترا شکرانہ ادا کرتی ہے

کہ ترے نظم و نسق سے جو ہیں رستے جاری
شرق تک غرب کی جنسیں ہیں پہنچتی ساری

ہم اُٹھا لیتے ہیں نفعِ درم و دام اُن سے
اور جو گھر بیٹھے ہیں پاتے ہیں وہ آرام اُن سے

کاروانوں کے شب و روز جو ہیں تار لگے
کوہ و صحرا میں جہاں دیکھو ہیں بازار لگے

رہے جس جا پہ مسافر کے لئے گھر ہے وہاں
شیر کنجشک جو چاہو تو میسر ہے وہاں

نہیں اصلا خطرِ رہزنیٔ دہر اُنہیں	ہے ترے فیض سے ہر دشت و جبل شہر اُنہیں
کوئی دم لیتا ہے رستے میں کوئی سوتا ہے	پر کہیں کیل کا کھٹکا بھی نہیں ہوتا ہے
اے شہِ امن اگر لطف ترا عام نہ ہو	اور ترے نظم پہ عالم کا سر انجام نہ ہو
ابھی بازارِ جہاں زیر و زبر ہو جاے	خانۂ امن و اماں موت کا گھر ہو جاے

صنعت و دستکاری

تھی نہ بات ان کی ابھی ختم پہ آنے پائی	اور تجارت یہ دُکان تھی نہ بڑھانے پائی
لوگ کچھ سامنے سے اور نمودار ہوئے	لیکن اس رنگ سے وہ داخلِ دربار ہوئے
جیسے تختہ ہو گلِ بوقلموں کا آتا	یا چمن ہو کوئی نیرنگ و فسوں کا آتا
خاک پر تھے گلِ ایجاد لگاتے آتے	پھول جھڑتے تھے جو تھے ہاتھ ہلاتے آتے
دستکاری نے کیا لعبتِ چیں تھا اُن کو	رنگ چمکا کے کیا نقشِ نگیں تھا اُن کو
چشمِ صنعت سے جو تھے کام بنائے اکثر	ضعفِ بینائی سے عینک تھے لگائے اکثر
تھے لئے نذر نہ کچھ گوہر و زر ہاتھوں میں	دستِ صنعت کے تھے گلدستۂ تر ہاتھوں میں
غرض آ کر سرِ تسلیم جھکائے سب نے	پیشکش لے کے جو آئے تھے دکھائے سب نے
کر چکے شاہ کا جس دم حقِ نذرانہ ادا	تب کیا جانبِ صنعت سے یہ شکرانہ ادا
اے شہِ امن ہمیشہ ہو یہ دربار کھلا	کہ اسی سایہ میں اپنا بھی ہے بازار کھلا
دستکاری کے عمل تجھ سے ہیں سارے چلتے	کام سب تیری بدولت ہیں ہمارے چلتے
تار ہے غیب کے اخبار سنائے جاتا	ریل کا تختِ سلیماں ہے اڑائے جاتا
کارخانے جو بڑے چلتے ہیں دن رات یہاں	اور کلیں کر رہی جو جو ہیں طلسمات یہاں
اے شہِ امن یہ تیری برکت ہے ساری	تیرے زوروں کی کلوں میں ہے حرکت ساری

دولت شکر کرتی ہے

سلسلہ صنع وصناعت کا ابھی تھا جاری
زرِ تقریر پہ نغمے کر رہے مینا کاری

دفعتاً چاندنی دربار پہ چھائی یکسر
ہو گئے سب درو دیوار طلائی یکسر

جیسے جھڑتے گلبن سے ہیں گلزار میں پھول
چاندی سونے کے برسنے لگے دربار میں پھول

کہ پری اتنے میں ایک دوش ہوا سے آئی
آئی لیکن عجب انداز و ادا سے آئی

حسن رفتار سے تھی سرعتِ سیماب اُڑتی
جائے دامن تھی فقط چادرِ مہتاب اُڑتی

حسن تھا گرچہ حقیقت میں ہوائی اُس کا
پر سراپا تنِ نازک تھا طلائی اس کا

ٹھوکروں میں تھی زر و سیم اُڑاتی چلتی
باغِ نرگس دمِ رفتار کھلاتی چلتی

تھی نہ تھمتی روش گردش ایام اک جا
لینے دیتی نہ تھی شوخی اُسے آرام اک جا

جبکہ وہ غیرتِ نورِ سحر آ پہنچی
پڑ گئی دھوم کہ دولت کی پری آ پہنچی

سامنے بادشہِ امن کے جس دم آئی
حسن شکرانہ میں یہ نغمہ دلکش گائی

کہ جہاں تیری بدولت سے ہر اک حال میں خوش
ہے کوئی شال میں خوش اور کوئی کھال میں خوش

گھر مہاجن کا جو لاکھوں سے ہے معمور سدا
خوش ہے دو پیسے کی مزدوری میں مزدور سدا

زیر دستوں کو ترے سایہ میں خوش مستی ہے
اپنا سر پیٹتی ہاتھوں سے زبر دستی ہے

ایک کا ایک پہ چل سکتا نہیں زور ذرا
مار کیا تاب جو بل مارے سر مور ذرا

بندوبستوں کو ضرر کچھ نہیں نقصانوں سے
ہاتھ ہیں دست درازی کے جدا شانوں سے

ہے تری نظم و نسق سے جو نظامِ عالم
مےِ آرام سے معمور ہے جامِ عالم

فتنہ انگیزی غدر و آشوب کی

تھی پڑی زمزمہ شکر سے دمساز ابھی
کہ عیاں جانبِ صحرا سے اک آواز ہوئی

وہ صدا سنتے ہی فق ہو گیا دربار کا رنگ
اور ہوا ہو گیا یکسر گل و گلزار کا رنگ

اہل دربار کہ تھے بزم جمائے بیٹھے
غم و افکار سے ہاتھ اپنے اُٹھائے بیٹھے

مضطرب ہو کے ہر اک جانبِ آواز چلا
مرغ دل میرا ابھی کھولے پر پرواز چلا

چلتے چلتے غرض اک دشت نظر آیا ہمیں
ماجرا دیدۂ عبرت نے یہ دکھلایا ہمیں

یعنی اک مرد دلاور ہے سر کوہ کھڑا
اور سرِ کوہ ہے گرد اُسکے اِک انبوہ کھڑا

تمتمائے ہوئے ہیں دھوپ سے رخسار اُس کے
لال انگارے ہیں دو دیدۂ خونخوار اُسکے

بدن اینٹھا ہوا اُبھرا ہوا سینہ اُن کا
کہ سدا مشقِ مشقت ہے قرینہ اس کا

خسروِ امن سے ہے بسکہ بندھی لاگ اُسکی
کودا گھوڑے سے ہے اور پکڑی ہے خود باگ اُسکی

نیزہ ٹیکے ہوئے ہے سب نظر ڈال رہا
ہر نظر سے ہے شرارت کے شرر ڈال رہا

اور یہ کہتا ہے کہ اے امن کے بندو آؤ
آؤ اے راحت و آرام پسند و آؤ

آؤ جلد آؤ کہ ہم مرد بنائیں تم کو
جامِ جرأت خمِ ہمت سے پلائیں تم کو

کر دیا سلطنتِ امن نے بزدل ہی تمہیں
نہ رکھا عیش و طرب نے کسی قابل ہی تمہیں

رات دن رہتے ہو آرام کے سامانوں میں
دن کو گلشن میں ہو اور شب کو شبستانوں میں

خواب غفلت میں ہو تم پاؤں پسارے سوتے
ہمت و عزم بھی ہیں ساتھ تمہارے سوتے

جرأت و حوصلہ سے تم کو رہا کام نہیں
ملک میں روز ترقی کا کہیں نام نہیں

خسروِ امن کی خدمت میں زمیں چومتے ہو
رات دن بیٹھے افیمی کی طرح جھومتے ہو

اس عمل میں ہی جوانی میں کیا پیر تمہیں
کیا بے قید ہی وابستۂ زنجیر تمہیں

آؤ اس قید بلا سے تمہیں آزاد کر دوں
اور ابھی صاحبِ اقبال خداداد کر دوں

زورِ بازو سے تم آفاق کو تسخیر کرو
دستِ تقدیر کو وابستۂ تدبیر کرو

عیش نے ہی جو تمہیں جان سے رنجور کیا
ضعف دل نے تمہیں ہمت سے ہے معذور کیا

کر دیا امن نے جو عیش کا پابند تمہیں
اور کیا بستر راحت کا ہے پیوند تمہیں

میں جہانگیر و جہاں گرد کرونگا تمکو
مرد اگر ہو تو جواں مرد کرونگا تمکو

ناپ ڈالو گے انہیں قدموں سے میدانِ جہاں
ایک کردو گے ابھی دشت و بیاباں جہاں

اپنے ہر کام کو آرام میں کھویا تم نے
ملک کا نام زمانے میں ڈبویا تم نے

میں ابھی خاک سے افلاک پہ پہنچادونگا
مثلِ خورشید جہاں میں تمہیں چمکا دونگا

گرچہ تھا خلق میں آشوب جہاں نام اُس کا
فتنہ انگیزئ عالم تھا سدا کام اُس کا

پر شہِ امن کے بندے تھے جو بھولے بھالے
گنبد امن میں آرام سے سونے والے

گرم و سرد اُن پہ زمانے کے نہ گذرے تھے کبھی
گود سے دایہ راحت کے نہ اُترے تھے کبھی

لایا تھا پاپیچ میں اپنے نہ کبھی غدر اُنہیں
اور نہ تھی سلطنتِ امن کی کچھ قدر انہیں

اس کی جانب قدم شوق بڑھائے سب نے
اور ادب سے سر تسلیم جھکائے سب نے

یعنی ہم تابع فرماں ہیں جدھر جائیے آپ
جان تک دینے کو حاضر ہیں جو فرمائیے آپ

ان میں یہ کوتہیِ فہم جو پائی اس نے
مکر کے ہاتھ کو دی اَور رسائی اُس نے

پہلے نزدیک اشارے سے بلایا اُن کو
جھک کے پھر کان میں یہ نکتہ سُنایا اُن کو

کہ شہ امن سے ہو شہر نہ خالی جب تک
ملک پائیگا تمہارا نہ بحالی جب تک

اور مدد اس میں تمہاری بھی ہے درکار ضرور
چاہئے میری رفاقت تمہیں اکبار ضرور

سب نے سینوں پہ رکھے ہاتھ کہ ہم حاضر ہیں
اور جہاں آپ قدم مارئے دم حاضر ہیں

یہ سخن سُنتے ہی ایک قہقہہ مارا اُس نے
اور کیا شہر کی جانب کو اشارہ اُس نے

دوڑ کر جست کی اور زینتِ رہوار ہوا
آتشِ فتنہ سے عالم پہ شرربار ہوا

شہر کی سمت کو رُخ اُس نے دلیرانہ کیا
ایسا للکار کے اک نعرۂ شیرانہ کیا

ہل گئی صدمہ سے جسکے طبقِ خاک تمام
تھرتھرانے لگے نُہ گنبدِ افلاک تمام

یہ بلا شورِ قیامت جو نمودار ہوا
دفعتاً چونک کے میں خواب سے بیدار ہوا

کُھل گئی آنکھ تو تھی شامِ سیہ فام وہی
وہی آزاد اور کرسیِٔ آرام وہی

دادِ انصاف

تھا دل آشفتہ جو شب گردشِ ایام سے میں
ہو کے بے خواب اُٹھا بسترِ آرام سے میں

دل تھا حق تلفیوں سے چرخ کے بیزار مِرا
اس کے بیداد سے برہم تھا دلِ زار مرا

جاگتے جاگتے وحشت سے جو گھبرایا میں
اور شبِ تار کی تنہائی سے تنگ آیا میں

جیب میں عقل کی کنجی کو ٹٹولا میں نے
اور کتب خانۂ خیالات کا کھولا میں نے

وہ کتب خانہ کہ جو علم کا گنجینہ تھا
یا کہ رودادِ زمانہ کا اک آئینہ تھا

کتبِ عہدِ قدیم اُس میں سجائی تھیں بہت
عہدِ آئندہ کی تصویریں لگائی تھیں بہت

بہت اوراق پریشاں کہ بہم تھے اُن میں
ماضی و حال کے احوال رقم تھے اُن میں

تھے پڑے دفترِ تاریخ کے اخبار بہت
اور نسب ناموں کے پھیلے ہوئے طومار بہت

اُنہیں اوراق میں اک مجھ کو نسب نامہ مِلا
کہ عجب مخزنِ اسرار پئے خامہ ملا

سر بسر تھے رقم احوال نکوفال اُس میں
خاندانِ شہِ انصاف کے تھے حال اُس میں

صدقِ روشن گہر آفاق میں تھا باپ اُس کا
چہرہ پر باپ سے روشن تھا سو آپ اس کا

تھا نسب اُس کے بزرگوں کا یقیں سے مِلتا
حقِ واقعہ کا بھی رشتہ تھا یہیں سے مِلتا

ہر شرف کا غرض اس گھر سے پتہ ملتا تھا
رفتہ رفتہ یونہیں ایمان سے جا ملتا تھا

ماں کی جانب ہیں دیانت کا تو فرزند تھا وہ
اور امانت کے کلیجہ کا جگر بند تھا وہ

دانش و داد نے دودا اپنا پلایا تھا اُسے
حسن اعمال نے گودوں میں کھلایا تھا اُسے

اُس نے جب ہوش سنبھالا تو بہت شاد ہوئے
ملکِ دل خرمی و عیش سے آباد ہوئے

بعد ازاں مکتبِ تہذیب میں سب لائے اُسے
تا کہ دنیا کی بھی کچھ عقل ذرا آئے اُسے

یاں ادب نے اُسے شائستۂ دلخواہ کیا
علم نے اُس کو ہر اک راز سے آگاہ کیا

کر چکے علم و ادب جبکہ ادا حق اپنا
اور فضیلت نے کیا نائبِ مطلق اپنا

ملک القدس کے دربار میں تب لائے اُسے
کہ معزز کسی اعزاز سے فرمائے اُسے

سرِ دربار بصد حسن و ادب آیا وہ
ایسے اداب سے تسلیم بجالایا وہ

کہ شہِ قدس اُسے دیکھ کے خورسند ہوا
اور ہر اک حاضرِ دربار رضامند ہوا

دونو اُستاد و اتالیق تھے ہمراہ آئے
باندھ کر دستِ ادب روبروئے شاہ آئے

کی یہ پھر عرض کہ تو خسروِ نورانی ہے
اور تجھے عالمِ بالا کی جہاں بانی ہے

چاند یہ اوجِ حکومت پہ جو چمکا ہے ترے
ملتجی آج فقط مہرِ کرم کا ہے ترے

اے شہِ قدس رہے مدنظر حال اس کا
ایسا چمکائیو تو نیرِ اقبال اس کا

کہ فزوں مہر سے ہو جاوے درخشانی میں
حکم ہوا اس کا رواں کشورِ انسانی میں

حال یہ علم و ادب نے جو سب اظہار کئے
اور قیافہ نے بیاں اس کے سب اطوار کئے

خسروِ قدس نے تب موردِ اعزاز کیا
خلعت و عزت و عظمت سے سرافراز کیا

اپنے اعزاز دوامی کا دیا تاج اُس کو
اور دعاؤں سے کیا صاحبِ افواج اُسکو

مشتری نے دیا عزت کا عمامہ اپنا
اور عطارد نے دیا ہاتھ سے خامہ اپنا

لقبِ خسروِ انصاف اُسے ارشاد کیا — اور روانہ بسوئے کشورِ ایجاد کیا
کہ ہوا ملکِ فنا ہے جو خرابات تمام — ستم و جور کی ہے چھائی ہوئی رات تمام
جا کے آفاق کو تم نور سے پُر نور کرو — اور خرابات جہاں عدل سے معمور کرو
نسخۂ سیرِ خیالی تھا سرِ دست ابھی — اور نظر سلسلۂ شوق سے پابست ابھی
کہ ورق چھوٹ پڑا ہاتھ سے یکبار مرے — نیند نے بند کئے دیدۂ بیدار مرے
چھائے ایسے یہ تصورِ دلِ بیتاب میں تھے — کہ جو تھے دل میں خیالات وہی خواب میں تھے
اس تصور نے غرض میری اُڑایا مجھ کو — دفعتاً ایسے بیابان میں لایا مجھ کو
وہمِ شاعر کی جہاں بات تھی پہنچی نہ کبھی — وسعتِ فرضِ محالات تھی پہنچی نہ کبھی
یک بیک عدل کے آثار نمودار ہوئے — اور تمام ارض و سما مطلعِ انوار ہوئے
بقعۂ نور کا اِک تختِ ہوادار اُترا — کہ جہاندارئ عالم کو جہاندار اُترا
تھا جلال اُس کے یہ چہرے کی درخشانی میں — جلی جاتی تھی نگہ دیدۂ حیرانی میں
تاب جب تابشِ انصاف کی پائی نہ کہیں — اور ہوئی اُس کی تجلی کی سمائی نہ کہیں
پردۂ ابرِ کرم سامنے ڈالے اُس نے — مگر اس پردے میں وہ رنگ نکالے اُس نے
کہ اِک آرام سا آنے لگا بینائی کو — اور ترقی ہوئی ہر دل کی توانائی کو
عالمِ قدس کے سب پاک نہاد آئے وہاں — بند و بست اُن کو جو درکار تھے فرما وہاں
جبکہ ساماں ہوئے سب بزمِ شہنشاہی کے — اور ہوئے نظم و نسق ماہ سے تا ماہی کے
توشۂ عدل ہوا جلوہ نمائے عالم — معتدل ہو گئی ہر پھر کے ہوائے عالم
ضعف و قوت بڑھی انداز سے یکساں آگے — اور کھری ہو گئی انصاف کی میزاں آگے
رات دن کو یہ ہوا حکم کہ تُل جائیں ابھی — نیک و بد جو ہوں زمانے میں وہ کھل جائیں ابھی

لی تھی ماں باپ کے وصفوں سے جو تاثیر اُس نے
اور پیا دایۂ دانش کا بھی تھا شیر اُس نے

چہرے پر رعبِ خداداد برستا تھا پڑا
حُسنِ خلق اُس کا مگر پھول سا ہنستا تھا پڑا

تھا لیئے ہاتھ میں ایک تیغِ شرربار عجیب
اس کے جوہر کا مگر تھا یہ کچھ اسرار عجیب

کاٹ میں بال کا چھوڑے نہ پس و پیش ذرا
اور نہ ہو تول میں تِل بھر کا کم و بیش ذرا

دوسرے ہاتھ میں فانوسِ فروزاں تھا لیئے
یا پئے جور و ستم آتشِ سوزاں تھا لیئے

گرچہ فانوس ہی تھی اس کے ہر اک بات نئی
نور فانوس میں پر تھی یہ کرامات نئی

یعنی اصلیّتِ اشیا کو دکھا دیتا تھا
نیک و بد صورتِ آئینہ بتا دیتا تھا

الغرض خسروِ انصاف کا دربار کھُلا
دل پہ عالم کے درِ دولتِ بیدار کھُلا

حق و اثبات چپ و راست وزیر اُسکے ہوئے
ذہن و ادراک و قیاس آ کے مشیر اُسکے ہوئے

مصلحت باندھے ہوئے عہد وفا تھی اُس سے
ہوتی تدبیر نہ اک آن جُدا تھی اُس سے

قہر اک سمت کو جوں شعلہ بھڑک جاتا تھا
رحم پر آبِ کرم آ کے چھڑک جاتا تھا

یمن و اقبال نے چمکایا وقارِ دربار
اور ہوا عظمت و شوکت پہ مدارِ دربار

کر چُکے نظم و نسق آ کے جو سب تیاری
تو ہوا پہلے یہ دربار سے فرماں جاری

کہ جو مظلوم ستمدیدہ بچارے ہوویں
اور وہ حق تلفیوں سے ظلم کے مارے ہوویں

بر سرِ وادیٔ انصاف ابھی لائیں اُنہیں
تا کہ تحقیق سے ہم داد کو پہنچائیں اُنہیں

شہِ انصاف کو یہ بات جو منظور ہوئی
اشتہاروں کی زباں سے وہیں مشہور ہوئی

کی پر اس حُکم نے دنیا تہ و بالا گویا
بلکہ گھر گھر عجب اِک تہلکہ ڈالا گویا

یاس اور آس کے اور شادی و ناشادی کے
تھے جو خوف و خطر آبادی و بربادی کے

تو جسے دیکھتے تھے اس کو لگی تھی اپنی
پڑ گئی تھی غرض ایک ایک کو اپنی اپنی

تھے جو حق تلفیوں سے لوگ دل افگار تمام
آن کی آن میں مظلوم و ستمگار تمام

ہوئے اس طرح فراہم سرِ میدانِ جہاں
ہو گیا حشر کا میدان بیابان جہاں

دوسرا حکم ہوا اور وہاں سے جاری
اور ہوا خلق میں شہرت کی زباں سے جاری

کہ جدا ہوویں ہر اک فرقہ کے اشخاص الگ
تا کہ احکام میں بھی عام ہوں خاص الگ

جبکہ تعمیل سے یہ حکم عمل میں آیا
تو گریبانِ ستم دستِ اجل میں آیا

پہلے اک فرقہ طلب بر سرِ دربار ہوا
حکم دربار سے اس طرح سے اظہار ہوا

کہ جو قبضہ میں ہو حقیت و املاک کوئی
نقد یا جنس جہاں ہو نہ افلاک کوئی

اُس پہ دعویٰ جسے کچھ ہو وہ بتا دیوے ابھی
اور جو کچھ پاس سند ہو تو دکھا دیوے ابھی

حکم یہ سنتے ہی دوڑے سوے دربار بہت
کھلے اسناد و فرامین کے طومار بہت

آل تمغا تھے بہ طغرائے سلاطین سلف
اور مطلّا و مزین تھے بہ آئینِ سلف

بہت اسناد و وثائق کے قبالے آئے
سیکڑوں مہر و شہادت کے حوالے آئے

پر نظر جب شہ انصاف نے ڈالی اپنی
تو وہیں ہاتھ میں فانوس سنبھالی اپنی

پھر شہادت کوئی پوچھی نہ گواہی دیکھی
اور نہ مہر و توزک دفترِ شاہی دیکھی

جو جو اسناد کہ در پیشیٔ انصاف میں تھے
تھے کھلے یا کہ دھرے گوشہ و اطراف میں تھے

انقلابوں نے زمانہ کے چھپایا تھا انہیں
یا کہیں خوفِ جرائم نے دبایا تھا انہیں

تھے وہیں زیرِ بغل یا کہ مکانوں میں چھپے
اور مکانوں میں بھی صندوقوں کے خانوں میں چھپے

روشنی پڑتے ہی فوراً وہ عیاں ہو گئے سب
جعل کے حرف جنہیں تھے وہ دھواں ہو گئے سب

جعل سازوں نے یہ جب دیکھا تو گھبرائے بہم
مکر و تزویر کے پرچے وہیں دوڑائے بہم

آئی دولت بھی مگر اس کی رسائی نہ ہوئی
اور سفارش سے وہاں کارروائی نہ ہوئی

طرفہ تر لطف یہ لیکن سر دربار ہوئے
بے نوا آئے تھے جو وہ امرا ہو گئے سب
الغرض حق کو پہنچ کر جو یہ حقدار آئے
کہ خطابوں نے بنایا تھا سرافراز انہیں
اُن میں وہ لوگ کہ جو صاحبِ دیدار بھی تھے
خاندانوں کی بزرگی نے بڑھایا تھا انہیں
سب سے پہلے وہ قدم مار کے آئے آگے
پر جب انصاف نے فانوس اٹھائی اپنی
تو وہ گمنام جو عالم میں سدا خوار رہے
کارناموں سے رہے خلق میں گمنام سدا
اب وہ رُخ پرتوِ اعزاز سے چمکانے لگے
پر جو دربار میں آئے تھے سرافرازی سے
لائے تدبیر کو مطلب کی گذارش کے لئے
حق کے آگے نہ مگر پیش کوئی بات گئی
اُن کے بعد اور اک انبوہ نمودار ہوا
تھے بہت زیرِ کلہ نخوتِ شداد لئے
سینہ زوری نے انہیں سینوں میں تھے زور دئے
سیکڑوں بادۂ دولت کے تھے مخمور اُن میں
بادشاہوں کے بھی دربار میں تھی راہ انہیں

کہ یکایک بدل اقبال سے ادبار ہوئے
جو امیر الامرا تھے وہ گدا ہو گئے سب
تو وہ انصاف طلب بر سرِ دربار آئے
دیتے القاب تھے سرمایۂ اعزاز انہیں
تن پہ چمکائے ہوئے خلعتِ زرتار بھی تھے
یا کہ دولت کی ہواؤں نے اُڑایا تھا انہیں
علم و فخر جو لائے تھے بڑھائے آگے
چاندنی پرتوِ انصاف نے چھائی اپنی
اور کئے کارِ نمایاں تو وہ بیکار رہے
کام سب ان کے جہاں میں گئے ناکام سدا
اُن کے سر پر علمِ اقبال کے لہرانے لگے
اب بھی باز آئے وہ ظالم نہ فسوں سازی سے
چٹھیاں لائے بہت اپنی سفارش کے لئے
اُن کی جو بات تھی آخر وہ خرافات گئی
پر عجب شان سے وہ واردِ دربار ہوا
اور بہت زیرِ بغل خنجرِ بیداد لئے
شورپشتی نے انہیں تھے سرِ پُرشور دئے
اور بہت زورِ حکومت سے تھے مغرور اُن میں
اور ہوا خواہ سمجھتا تھا ہر اک شاہ انہیں

ظلم گردوں کی طرح چھائی تھی بیداد اُنکی / کسی دربار میں سُنتے نہ تھے فریاد اُن کی
اُن کے مظلوم کہ تھے ظلم کے مارے سارے / عدل کی آس پہ بیٹھے تھے بچارے سارے
جو ستم اُن پہ ہوئے تھے وہ جتا سکتے نہ تھے / لب تلک نالۂ پُر درد کو لا سکتے نہ تھے
پر جو تھا خسروِ انصاف کا دربار یہاں / اور نہ تھا رو و رعائت سے سروکار یہاں
یا تو ہر معرکہ میں تھے وہ ستمگار آگے / یاں مگر ہو گئے مظلوم دل افگار آگے
روشنی پڑتے ہی آئینہ ہوئے حال اُن کے / خود بخود کھُل گئے سب دفترِ اعمال اُنکے
دستِ ظلم اپنے ستمگار اُٹھا بھی نہ سکے / بلکہ جو ظلم کئے تھے وہ چھپا بھی نہ سکے
قہر سے کی جو شہِ عدل نے اِک بار نگاہ / ہوئی اس طرح سے اُن سب پہ شرر بار نگاہ
کہ جو تھے شیر کی کھالوں میں اکڑتے آئے / اور ہوا سے دمِ رفتار جھگڑتے آئے
جامے جل جل کے وہ سب ان کے سرِ خاک گرے / اور لفافوں سے نکل کر جو وہ بیباک گرے
رعب سے خسروِ انصاف کے تھرانے لگے / سب کی سب صورتِ روباہ نظر آنے لگے
شہِ انصاف نے اُس دم یہ صدا دی سب کو / اور مُنادی نے وہیں آکے ندا دی سب کو
کہ جو زیر ان سے تھے اب تک وہ دلیران رہیں / اور مسلّط وہ سدا صورتِ شیران پہ رہیں
لوگ کچھ زمرہ اعزاز میں واں اور آئے / پر جو دیکھا تو نظر اُن کے عجب طور آئے
علما و فضلا و بلغا تھے سارے / اور بھرے سر میں فضیلت کی ہوا تھے سارے
تھے بہت جبّہ و عمامۂ شالی رکھتے / اور بظاہر تھے مُٹاپے کی بحالی رکھتے
روٹیاں مسجدوں میں کھاتے تھے دن رات پڑے / مفت خوری میں بسر کرتے تھے اوقات پڑے
سر پہ دستارِ مشیخت کی بہت بھاری تھی / اور شکم خالی کتابوں کی اک الماری تھی
تھے مگر ایسے بھی اُن میں زدہ احوال بہت / کہ لکدکوبِ مشقت سے تھے پامال بہت

شمع ساں آتشِ تصنیف میں گھلتے تھے سدا
پھٹے کاغذ کی طرح خاک میں رلتے تھے سدا

تھے پڑے بند قلمدان میں ناکامی کے
اور نکلتے تو ہدف ہوتے تھے بدنامی کے

پر جو نامنصفیِ دہر نے مارا تھا انہیں
سخت دشوار زمانے میں گذارہ تھا انہیں

غرض انصاف نے جب پرتو ڈالا اپنا
رنگ تب معنیِ اصلی نے نکالا اپنا

مل گئے خاک میں اعزاز خیالی سب کے
جل گئے خلعتِ زرینہ و شالی سب کے

زمرہ علم میں کچھ اور بھی اشخاص آئے
زہد و تقویٰ و ارادت سے باخلاص آئے

بسکہ وابستۂ طاعات و عبادات تھے وہ
خلق میں قبلۂ حاجات و مرادات تھے وہ

فقر نے مکر کی تصویر بنایا تھا انہیں
خرقہ پوشی نے مرقعہ میں سجایا تھا انہیں

دیتے جاروب سر خاک تھے جامے ان کے
چھتریاں سر پہ لگائے تھے عمامے ان کے

سب کے سب ہاتھوں میں تسبیحیں ہلاتے آئے
عرض حال اپنے وظیفوں میں سناتے آئے

کیا پیری نے تھا روشن رخِ نورانی کو
اور نشاں سجدہ کے چمکاتے تھے پیشانی کو

پارسائی کے یہ دعوے تھے زمانے میں انہیں
تا بہ دربار بھی سو عذر تھے آنے میں انہیں

تھے مگر اس پہ بھی اک ایک سے آگے جاتے
اور یہ کہتے سوئے دربار تھے بھاگے جاتے

کہ زمانے کا کوئی لطف نہ پایا ہم نے
اور کچھ آرام نہ دنیا کا اٹھایا ہم نے

آئے دنیا کے نہ افسونِ فسانہ میں کبھی
اور ہوئے عیش سے واقف نہ زمانے میں کبھی

آج سجادہ نشینی کا ہو اعزاز ہمیں
کیجئے تاجِ کرامت سے سرافراز ہمیں

جب کرامات یہ اک اک نے سنائی اپنی
شہِ انصاف نے فانوس ہلائی اپنی

معرفت شمع فروزاں لئے یک بار آئی
کرتی اصلیت اشیاء کو نمودار آئی

مکر و تزویر ہوئے اڑ کے ہوائی سارے
کھل گئے زہدِ خدائی و ریائی سارے

جو یہ کہتے تھے کہ دنیا سے ہمیں کام نہیں — بلکہ عورت کا کبھی ہم نے سُنا نام نہیں
یاں جو دیکھا تو حریفِ مے و مینا نکلے — اُن کے پہچاننے والے بھی وہیں آ نکلے
یعنی کچھ عورتیں کرتی ہوئی زاری دوڑیں — نان و نفقہ کی طلبگار بچاری دوڑیں
بچے کچھ کہتے ہوئے دوڑے کہ بابا بابا — پر یہ شرمائے کھڑے تھے کہ کہیں کیا بابا
علم کی ذیل میں کچھ لوگوں نے آنا چاہا — بزمِ اعزاز میں رنگ اپنا جمانا چاہا
سندِ علم تو کچھ رکھتے نہ تھے ساتھ اپنے — خوانِ معنی سے تھے البتہ بھرے ہاتھ اپنے
قتلِ مضموں تھا زمانے میں فقط کام اُن کا — نکتہ چینی سے تھا مشہورِ جہاں نام اُن کا
گرچہ شورش کے قدم آگے بڑھائے ہوئے تھے — رو سیاہی میں رلے مُنہ کو چھپائے ہوئے تھے
الغرض بڑھ کے وہ جس دم سرِ دربار آئے — لوگ اُنہیں دیکھتے ہی جوش میں یکبار آئے
اور یہ چلائے کہ ہے علم سے کیا کام انہیں — مشغلے اور ہی کچھ ہیں سحر و شام انہیں
کوئی تصنیف ہو ان کی تو دکھا دیویں ذرا — ہو جو تقریر کا دعوے تو سُنا دیویں ذرا
سُن کے اس بات کو اُنکے بھی ہوئے کان کھڑے — سامنے تخت کے گھبرائے ہوئے آن کھڑے
سوچ کر ہوش و حواس اپنے سنبھالے آخر — تھے بغل میں کئی کاغذ وہ نکالے آخر
اور یہ کی عرض کہ لکھنا تو نہیں جانتے ہم — پر مٹانے میں ہیں آندھی کو بھی کم مانتے ہم
یہی باعث ہے کہ فرصت نہیں اک آن ہمیں — اس مرض نے ہی نہایت کیا حیران ہمیں
ورنہ تصنیف کریں ہم تو وہ تصنیف کریں — کہ اُسے آپ بھی گر دیکھیں تو تعریف کریں
سُن کے اس بات کو اک قہقہہ مارا سب نے — اور کہا کاغذوں پر کر کے اشارہ سب نے
کیا خرافات اُٹھا لائے ہو لے جاؤ انہیں — اور کبھی بر سرِ دربار نہ پھر لاؤ ہمیں
لوگ اتنے میں باانبوہ کثیر آئے بہت — اہلِ دربار اُنہیں دیکھ کے گھبرائے بہت

تھے کچھ آپس میں وہ کرتے ہوئے تکرار آتے
غل مچاتے ہوئے سب تھے سوئے دربار آتے

اُن کا غل جبکہ بہت حد سے زیادہ پہنچا
شہ کا تب حکم یہ اک لے کے پیادہ پہنچا

کہ ادب شاہ کا اتنا نہ فراموش کرو
کیوں ہیں غل اتنا مچاتے انہیں خاموش کرو

اہل سیف آگے بڑھے تیغ زباں تولے ہوئے
پیش قدمی کے دلائل سے علم کھولے ہوئے

ساتھ ہی اہل قلم بولے یہ امکان نہیں
اور یہ آئینِ ادب میں کبھی شایان نہیں

جاہلیت کی حمیت کو نہ یہاں لاؤ تم
علم سے جہل جو بڑھ جائے تو بڑھ جاؤ تم

صاحب تجربہ پر اُن میں جو شامل تھے بہت
اور وہ تدبیرِ مہمات میں کامل تھے بہت

بیچ میں آن کے چلائے کہ جانے دو انہیں
گر قدم تم سے بڑھاتے ہیں بڑھانے دو انہیں

کہ یہی سر بھی ہیں میداں میں کٹانے والے
ملک کے نام کو سر دے کے بڑھانے والے

کیا ہوا ان سے تمہارے جو قدم پیچھے ہیں
سوے دربار تم آگے چلو ہم پیچھے ہیں

حُکم پھر خسروِ انصاف نے اک اور دیا
اشتہاروں نے وہیں آکے اسے دَور دیا

یعنی جو لوگ کہ خواہان مناصب ہوویں
اور لیاقت سے مناصب کے مناسب ہوویں

سامنے خسروِ انصاف کے سب آئیں ابھی
اور جو اسنادِ لیاقت ہوں وہ دکھلائیں ابھی

حکمِ دربار یہ سُن کر بہت اشخاص چلے
کچھ بصد ناز چلے کچھ بصد اخلاص چلے

اُن میں وہ لوگ کہ تھے دعوے اعزاز انہیں
قد و قامت کی وجاہت سے بھی تھے ناز اُنہیں

خلعتِ کہنہ بزرگوں کے سجاتے آئے
اور خطاب اُن کے کتابوں سے سُناتے آئے

پر وہ دربار میں جب آئے عدالت کے لئے
اور بڑھی لاف و گزاف ان کی وکالت کے لئے

توشۂ عدل نے فانوس کو چمکایا ذرا
نورِ تحقیق نے بھی پرتو دکھلایا ذرا

کُھل گئی اُن کی حقیقت تو وہ گھبرا کے ہٹے
اور جو تھے آگے بڑھے پیچھے کو شرما کے ہٹے

خسروِ عدل نے تب غور سے سب کو دیکھا — پہلے ایک ایک کے حسب اور نسب کو دیکھا
جس قدر اہلِ شرافت نظر آئے اُن میں — اور پھر اوصاف لیاقت کے بھی پائے اُن میں
پاس بلوا کے بہت موردِ اعزاز کیا — اور اُنہیں منصبِ عالی پہ سرفراز کیا
پر اک انبوہ کثیر اُن میں جو ناکام ہوا — کام کا اُس کے نہ مقصد بہ سرانجام ہوا
شور و فریاد سے کرنے لگا آفت برپا — گیا دربار میں اک شورِ قیامت برپا
ایسے چلّائے کہ میں چونک کے بیدار ہوا — لیکن اس بات سے خوش میرا دلِ زار ہوا
کہ لیاقت سے جو تھے منتخب اشخاص ہوئے — میرے احباب اُن اشخاص میں تھے خاص ہوئے
سامنے پیچتے تھے دشمنِ بدکیش مرے — رہے ناکام سب اعدائے بد اندیش مرے

وداعِ انصاف

جب طورِ دمِ صبح شبِ تار کا بدلا — اور رنگ چمن میں گل و گلزار کا بدلا
شبنم نے گہر فرش کیئے خاک کے اوپر — اور تارے لگے ڈوبنے افلاک کے اوپر
چلنے کو بہم آنکھ لگے مارنے سارے — اور چاند پہ جانوں کو لگے وارنے سارے
آئی جو صبا لوٹ کے نسرین و سمن میں — انگڑائیاں لینے لگیں شاخیں بھی چمن میں
لی صبح کے پہلو پہ اُدھر رات نے کروٹ — لی خاک پہ یاں مستِ خرابات نے کروٹ
زاہد جو افیمی کی طرح جھوم رہا تھا — اور بیٹھا مصلے پہ زمیں چوم رہا تھا
بیدار ہوا سُن کے مؤذن کی اذاں کو — آزادؔ جو تھا صرفِ سخن کر رہا جاں کو
ہشیار ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے — اور وقتِ سحر نکلا ہوا کھانے کو گھر سے

تا فیض سحر سے ہو دلِ راز شگفتہ
اور ہو کوئی دم جانِ پر آزار شگفتہ

پر طائرِ دل جب قفسِ شہر سے نکلا
اور قلزم افکار کی میں لہر سے نکلا

دیکھا کہ سوئے دشت ہے دنیا چلی جاتی
اور خلق ہے دوڑی سوئے صحرا چلی جاتی

حیرت ہوئی میرے دلِ بے تاب و تواں کو
اور پوچھا ہر اک شخص سے اس رازِ نہاں کو

پر دل کا خلش تھا سو مٹایا نہ کسی نے
اس پردۂ حیرت کو اُٹھایا نہ کسی نے

آخر کو نظر عقل نظر باز سے لے کر
اور شوق کے بازو پر پرواز سے لے کر

پابند بر فتارِ زمانہ ہوا میں بھی
ساتھ اُنکے سوئے دشت روانہ ہوا میں بھی

جب شہر کے میدان سے ہم دور تر آئے
اور سامنے راوی کے کنارے نظر آئے

دیکھا کہ سرِ راہ کچھ اشجار ہرے ہیں
دامانِ تمنا کو طراوت سے بھرے ہیں

اک شاہ اُسی جا پہ سرِ خاک ہے بیٹھا
بیٹھا ہے مگر سخت غضبناک ہے بیٹھا

اور سامنے کچھ باندھے ہوئے ہاتھ کھڑے ہیں
کچھ برہنہ سر آور کہ جو ساتھ کھڑے ہیں

وہ آکے گرے پاؤں پہ با دیدۂ تر ہیں
اور عفو جرائم کو جھکائے ہوئے سر ہیں

پر شاہ نے تلوار کو کھولا ہے کمر سے
اور افسرِ شاہی کو بڑھا ڈالا ہے سر سے

دیکھی جو یہ روداد تو حیراں ہوا میں
جب حد سے سوا دل میں پریشاں ہوا میں

ایک ایک سے پوچھا کہ ہوا واقعہ کیا ہے
اور شہر میں کیا چل گئی وحشت کی ہوا ہے

وہ ہو رہے سب مضطر و ناچار تھے ایسے
اور اپنی مصیبت میں گرفتار تھے ایسے

آتی تھی کسی میں نہ نظر بات کی حالت
تھی بات کی حالت نہ اشارات کی حالت

اک پیر کہن اتنے میں نزدیک تر آئے
اور ہوش بھی کچھ اُن کے ٹھکانے نظر آئے

یہ عقدۂ سر بستہ رکھا سامنے اُن کے
کھولا یہ معما لبِ ناکام نے اُن کے

یعنی کہ ہے یہ شاہ شہنشاہِ مروّت
اب اس نے جو دیکھا کہ ہے رنگ اور یہاں کا
دنیا میں ہے بگڑی ہوئی اک اک کی نیّت
اس واسطے سب جاہ و حشم چھوڑ کے اپنا
ہے چھوڑتا سب مملکت و مال کو ان کے
خود گوشۂ عزلت میں گذارہ کرے اپنا
اتنے میں جو تھے لوگ پس و پیش پریشاں
سب مل کے فراہم ہوئے اور متصل آئے
اُس بھیڑ میں آشوب سا اِک دفعتہً آیا
جو راس و چپ اُنمیں تھے چپ و راس ہوئے سب
پہنچا تھا میں اب فاصلہ پر مدنظر کے
دیکھا ہوا اُستاد ہے سلطانِ مروّت
اب کھولتا ہے تیغ کو ہمّت کی کمر سے
گو چشمِ غضبناک سے ہے قہر ٹپکتا
اور کہتا ہے وہ بادشہِ معدلت اندیش
بھیجا ملک القدس نے تھا مجھ کو جہاں میں
ہو دین وہی اُن کا جو ہے دین مروت
آپس کی رفاقت سے چلیں کام سبھوں کے
پیدا جو خدا نے ہے کیا کون و مکاں کو

تھی اس سے زمانے میں رواں راہ مروت
ایمان ٹھکانے نہ رہا اہل جہاں کا
اور خوار ہوئی بد سے فزوں نیک کی نیت
اور سلطنتِ خلق سے مُنہ موڑ کے اپنا
تا ان کی سزا سونپ کے اعمال کو ان کے
سرِ خاک پہ اک اک یہاں مارا کرے اپنا
تھے نیک و بد اُن میں بدل خویش پریشاں
یا مردہ نکل کر ہیں تہ خاک سے آئے
یا پانی کا ریلا کہ جو تھا موج زن آیا
میں جن میں کھڑا دور تھا وہ پاس ہوئے سب
کی جبکہ نظرِ شوق کے شانوں پہ اُبھر کے
کرتا ہے عیاں حال پریشان مروت
اور ہاتھ میں ہے افسرِ شاہی لیا سر سے
پر لب سے غم و یاس کا ہے زہر ٹپکتا
اک اک سے کہ اے فرقۂ ناعاقبت اندیش
تا خلق خدا جو ہو زمین اَور زماں میں
اور نظم و نسق ہووے بآئینِ مروّت
نیکی سے ہوں مشہور جہاں نام سبھوں کے
اور عالمِ اسباب بنایا ہے جہاں کو

کام ایک پہ ہے ایک کا یاں منحصر ایسا
اور اُن میں بہم سلسلہ باندھا ہے پھر ایسا

جس سلسلہ بندی کی جُدائی نہ ہو ممکن
اور ہو کے جُدا کارروائی نہ ہو ممکن

مِل جُل کے زمانہ میں گذارے ہو سبھوں کے
آپس کی مروت پہ سہارے ہو سبھوں کے

اور سب کو سہارا ہو خداوندِ جہاں کا
اُس بن ہو گذارہ نہ زمیں کا نہ زماں کا

پر یاں تو ہیں سب بادہ نخوت پیئے بیٹھے
دعوے ہیں خدائی کے بغل میں لئے بیٹھے

گذری ہوئی گردوں سے ہے گردن کشی ان کی
اور اُس پہ وہ خودرائی و خودمطلبی ان کی

نیکی پہ سمجھتے ہیں خلائق کی بدی کو
اور دیکھ نہیں سکتے زمانے میں کسی کو

افسوس کہ رتبہ مرا جانا نہ کسی نے
اور میں نے جو سمجھایا وہ مانا نہ کسی نے

لیکن جو زمانے میں یہی کام ہیں ان کے
خود دیکھینگے اِک دن جو کچھ انجام ہیں اِن کے

ہر چند ہیں آج اہل زمانہ مرے دشمن
اور چاہتے ہیں حق کو مٹانا مرے دشمن

پر ہونے دو ان کو جو ہیں سب بر سرِ کیں یہ
جائینگے کہاں بچ کے یہیں میں ہوں یہیں یہ

یہ سُن کے ذرا ہوش میں ہر بے خبر آیا
اور اتنے میں اِک طرفہ تماشا نظر آیا

دو شخص سرِ معرکہ واں دفعتہً آئے
اور شاہ کے پہلو میں بہ درد و محن آئے

سر اپنے جھکائے ہوئے غمناک تھے دونو
اور درد سے با دیدۂ غمناک تھے دونو

دونو کی وزارت تھی بہ دربارِ مروّت
اور چلتا انہی دونو سے تھا کارِ مروت

اک اُن میں کہ تھا برف سے ڈھالا بدن اُسکا
تھا اُس کا بڑھاپا نمدی پیرہن اُسکا

وہ خلق خدا میں تھا جو غمخوار سبھی کا
اور آنکھ سے دُکھ دیکھ نہ سکتا تھا کسی کا

جس پر کوئی صدمہ ہو وہ غم کھاتا تھا گویا
اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گھُلا جاتا تھا گویا

وُہ رحم تھا اور رحم سدا کام تھا اُس کا
تمغائے وزارت پہ رقم نام تھا اُس کا

اک دوسرا شخص اور جو ہمراہ تھا اُس کے
وہ نسخۂ حیرت بہ نگاہِ عقلا تھا
کچھ توڑے زرِ نقد کے تھے ہاتھ میں اُس کے
پر ہاتھ میں توڑے جو پُر از دام و درم تھے
عالم میں سخاوت سے کرم اُس کا لقب تھا
دنیا سے کنارہ جو کیا شاہ نے اُس کے
میرے عملِ خیر کی یاں قدر نہیں ہے
ہیں بسکہ بد اندیش پئے خلقِ خدا یہ
دل سینۂ گندم سے بھی ہے تنگ تر ان کا
اب یاں سے چلا شاہِ خوش اقبال ہے اپنا
دونوں وہ غرض باندھ کے دستِ ادب آئے
بے شبہ وفا کا تو یہاں نام نہیں ہے
افسون و فسانہ پہ یہ دل دادہ ہیں سارے
حضرت نے جو تجویز کیا عین بجا ہے
پر شاہ سے یہ عرض نمکخوار ہیں کرتے
گو اہلِ جہاں پھیر ہیں رخ راہِ وفا سے
پر ایسے بھی موجود ہیں اشخاص جہاں میں
سلطانِ مروّت کو ہیں جو شاہ سمجھتے
یہ وضع زمانے کی خوش آئی نہیں اُن کو

چہرے پہ برستا حشم و جاہ تھا اُس کے
اور تن پہ جو کی غور تو کندن سے ڈھلا تھا
صندوق خزانوں کے تھے کچھ ساتھ میں اُسکے
خالی تھے بہت اُن میں بھر رہ گئے کم تھے
اور بارِ وزارت وہ اُٹھائے ہوئے سب تھا
سمجھا یہ مناسب دلِ آگاہ نے اُس کے
اور دور بخیلوں کا تہِ چرخ بریں ہے
دینا تو جہنم میں گیا دیویںگے کیا یہ
دیتے کو جو دیکھیں تو ہے پھٹتا جگر ان کا
جو شاہ کا حال اپنے وہی حال ہے اپنا
اور اُن کے دلوں سے یہ سخن زیرِ لب آئے
یہ ملکِ فنا قابلِ آرام نہیں ہے
اور دل میں بغاوت پہ یہ آمادہ ہیں سا
اب یہ رہیں گمراہ یہی ان کی سزا ہے
اور مصلحتِ وقت کو اظہار ہیں کرتے
اور باندھے ہیں پیمانِ وفا مکر و دغا سے
اور جوہرِ اخلاص سے ہیں خاص جہاں میں
اور شاہ کو ہیں سایۂ اللہ سمجھتے
اِن قدموں سے منظور جدائی نہیں اُنکو

باقی رہی دنیا کی ہوس کوئی رہی ہے — اب اُن کو تمنّا جو رہی ہے تو یہی ہے
ہم یعنی کہ ہیں شاہ کے شرمندۂ احساں — اور بندۂ حق وہ ہے جو ہے بندہ احساں
جو جو کہ شرف پائے ہیں اس فیض کرم سے — شکر اُن کے ادا کچھ نہیں ہو سکتے ہیں ہم سے
اک بار مگر سامنے ہوں شاہ کے اپنے — اور جوش جو ہیں جانِ ہوا خواہ کے اپنے
وہ رنگ میں شکریہ کے اس آن نکالیں — اور سینوں میں جو کچھ ہیں وہ ارمان نکالیں
جب لب پہ یہ اُنکے سخن پُر اثر آئے — اُس شاہ کی آنکھوں میں بھی تب اشک بھر آئے
گذرے دلِ غمگیں پہ خیالات ہزاروں — اور پیش نظر پھر گئے حالات ہزاروں
کچھ بعد تامّل کے مگر اُن سے کہا یہ — اُن کی جو تمنّا ہے تو پھر بات ہی کیا یہ
گو روکتا میرا دلِ مجبور ہے مجھ کو — پر سب کی خوشی جو ہے وہ منظور ہے مجھ کو
دی جبکہ اجازت شہِ فرخندہ لقب نے — شہرت کی منادی سے وہیں سن لیا سب نے
پابند مروت جو کچھ اشخاص تھے اُن میں — اور جلوہ نما جوہرِ اخلاص تھے اُن میں
ہر سمت سے وہ فرقہ بفرقہ ادھر آئے — اور شاہ کے شکریہ کو باچشمِ تر آئے
اک فرقے کا احوال نظر طرفہ تر آیا — وہ سب سے مقدم تھا قدم مار کر آیا
دولت تھی زر و سیم لٹاتی ہوئی آگے — اور دور سے تھی نور اُڑاتی ہوئی آگے
شہرت کے دوامی نے کئے نام تھے روشن — آغاز کی نسبت بہت انجام تھے روشن
امیدیں خلائق کی جو تھیں اُن کی طرف تھیں — اور آنکھیں زمانے کی لگیں اُن کی طرف تھیں
تھے اہل جہاں گرد اُمنڈ آئے ہزاروں — اور دامنِ امید تھے پھیلائے ہزاروں
تھا ظلم کی ظلمت سے جو ظلمات زمانہ — اور دن سے ہوا آنکھوں میں تھا رات زمانہ
تھی نور بقا شمع جلائے ہوئے آگے — ہاتھوں کے دئے سب کے تھے آئے ہوئے آگے

پر شکل سے ملبوس سے اور طرز سخن سے — تھے مختلف الوضع جو وہ اصل و وطن سے
میں اُن میں کسی شخص کو تھا جان نہ سکتا — اور کون ہیں یہ لوگ تھا پہچان نہ سکتا
وہ فرقہ مگر جب مرے نزدیک تر آیا — اور ان میں مجھے حاتمِ طائی نظر آیا
سمجھا کہ سخاوت کے یہ پروردہ ہیں سارے — اور چشم مروت کے نظر کردہ ہیں سارے
بعد اُن کے جو اشخاص کہ آتے نظر آئے — وہ شان و شکوہ اَوْر دکھاتے نظر آئے
تھے دولت و اجلال جلو میں لئے آتے — اور سر پہ ہما اُن کے تھے سایہ کئے آتے
تھے چترِ شہی ہو رہے قربان سروں پر — اور تاج فدا کر رہے تھے جان سروں پر
پر دخل نہ وہاں تک تھا ذرا تاج زری کا — افسر تھا سرِ فرق دھرا ناموری کا
لہرا رہے اک اک کے سر پر جو علم تھے — اعزاز دوامی کے نشاں اُن پہ رقم تھے
تھے اُن پہ جو تاروں کی طرح نام چمکتے — تا حشر رہینگے سحر و شام چمکتے
تھے نور سے تمکین و وقار اُن پہ برستے — اور پھولوں سے تھے رنگ بہار اُنپہ برستے
یکساں تھے بہ حیثیت اقبال وہ سارے — پر وضع میں تھے مختلف الحال وہ سارے
کچھ راز نہاں دل پہ ہوا جسکا عیاں تھا — کسرٰے لقب اُن میں شہ نوشیرواں تھا
میں سمجھا کہ ایسے جو بہ تمکین ہیں آتے — اقلیم عدالت کے سلاطین ہیں آتے

گنجِ قناعت

مصروف تھا میں سیر میں شب عالمِ جاں کی — اور زیر نظر راہ تھی اسرار نہاں کی
ہر چند تھا جوں نقش قدم خاک کے اوپر — پر خاک پہ تھا میں گئے افلاک کے اوپر

ہر دم مجھے گھر بیٹھے زمانے کا سفر تھا
اور پائے تصور سے ہر اک دل میں گذر تھا

کھولے ہوئے دروازہ ہر اک سینہ تھا آگے
جو سینہ تھا گویا کہ اک آئینہ تھا آگے

سینہ میں کبھی جاں میں کبھی اور کبھی دل میں
اور دل سے پہنچتا تھا کبھی آنکھ کے تل میں

روشن صفتِ آئینہ حالات تھے اُن کے
اور جوہر آئینہ خیالات تھے اُن کے

ہر منعم و ہر مفلس و ہر شاہ کو دیکھا
ہر میکش و صوفیِ دل آگاہ کو دیکھا

ہر چند کہ رفتار بہ سیر سفری تھی
آنکھوں پہ مگر عقل کی عینک جو دھری تھی

ہر دل میں نظر آتے تھے ارمان ہزاروں
اور اُن میں خیالات پریشان ہزاروں

القصہ ہر اک خانہ و کاشانہ میں ہو کر
یعنی کہ ہر اک دل کے نہاں خانہ میں ہو کر

جب پائے نظر میں نے رکھا پیشتر اپنا
اک ایسے دلِ پاک میں پایا گذر اپنا

ہر چند کہ تھا تنگ وہ اوضاع جہاں سے
وسعت میں تھا کم دیدہ کوتہ نظراں سے

پر گوشہ میں بیٹھا تھا لئے کون و مکاں کو
اور آنکھوں میں طے کرتا تھا میدان جہاں کو

دیکھا کہ ہے آراستہ اک انجمن اُس جا
اور جلوۂ انوار ہیں پرتو فگن اُس جا

ہر چند کہ دربار تو شاہانہ نہیں تھا
اُس دور میں جمشید کا پیمانہ نہیں تھا

پر تھا عجب اک نور کا جلوہ کہ نہ پوچھو
اور اُس کا دلوں پر وہ اثر تھا کہ نہ پوچھو

وہ گھر کہ جو سرمایۂ آسودہ دلی تھا
اور کعبۂ دل خلق میں گر تھا تو وہی تھا

واں ڈر کی جگہ دل میں ادب ہوتے تھے پیدا
جو رعب کے ثمرے تھے وہ سب ہوتے تھے پیدا

اک مردِ مقدس جو وہاں صدر نشیں تھا
اور کعبۂ عظمت کے مکاں کا وہ مکیں تھا

عالم میں زن و مرد سے لے پیر و جواں تک
آئے کہ نہ آئے کوئی اُس بزم میں واں تک

تھا صدق سے ہر شخص کے دل میں ادب اُسکا
اور خلق میں تھا خواجہ قناعت لقب اُس کا

حاضر تھی جو خدمت میں جماعت ندما کی — ہوتی نہ ریاضت کبھی پہلو سے جدا تھی
اخلاق تھے یاران قدیمی میں ہمیشہ — اور صبر و توکل تھے ندیمی میں ہمیشہ
ہر چند کہ اک گوشہ میں سجادہ گزیں تھا — پر مسند عزت کے لئے صدر نشیں تھا
تھا تاج زری سر پہ نہ سرمایۂ شوکت — اور زیر قدم تخت نہ تھا پایۂ شوکت
پر کہتی تھی دولت کہ یہ ہمت کا دھنی ہے — صورت یہی کہتی تھی کہ معنوں کا غنی ہے
تھی اُس کے سراپا سے عیاں شانِ قناعت — اور پاؤں لپیٹے تھا بدامانِ قناعت
تھا بسکہ زمانہ سے سروکار نہ اُسکو — دنیا کی ہوس تھی کوئی زنہار نہ اُسکو
نیت تھی نہ جاتی کبھی مضمون طلب تک — اور تھی نہ ہوس دل میں جو آتی کبھی لب تک
تھی چشم تمنا نہ کسی چیز پر اُسکی — آنکھوں سے اُبھرتی تھی نہ باہر نظر اُسکی
وہ شمع صفت گرچہ سر بزم تھا بیٹھا — اور عزم ہدایت پہ بصد حزم تھا بیٹھا
پر دل جو پھرا تھا ہوس ملک فنا سے — اور رخ تھا بچائے ہوئے دنیا کی ہوا سے
نور اُس کا تو آفاقِ جہاں گھیرے ہوئے تھا — جس رخ سے مگر دیکھئے منہ پھیرے ہوئے تھا
جو لوگ وہاں اہل طریقت سے تھے آتے — سب اہل یقیں دل کی عقیدت سے تھے آتے
ملتی تھی جنہیں کچھ خبر اس راز نہاں سے — اک عینک اُنہیں ایسی عطا ہوتی تھی واں سے
جو دل کے لئے مایۂ روشن گہری تھی — اور بہر نگہ سرمۂ عالی نظری تھی
جوہر یہ کرامات کے تھے اس کے اثر میں — کر دیتی تھی ہر چیز کو ناچیز نظر میں
یا دور کے مقصد کو تھی نزدیک لے آتی — اور سامنے اس طرح سے تھی ٹھیک لے آتی
موجود کبھی ہوتے تھے مقصود نظر میں — یکساں تھے کبھی بود بہ نابود نظر میں.
تھا جلوۂ رُخ سامنے اُس مرد خدا کا — جو دفعتہً ایک آگیا جھوکا سا ہوا کا

قدرت کا تماشہ وہ دکھاتا ہوا آیا
اک پرچۂ اخبار اُڑاتا ہوا آیا

قاصد کی طرح آن کے قالب میں صبا کے
رکھتا بہ ادب سامنے اُس مرد خدا کے

وہ نامہ دیا پیک صبا نے جو ہیں لاکر
دیکھا اُسے تب خواجہ قناعت نے اُٹھاکر

طوفان طمع میں جو پڑی خلق خدا تھی
اور چلتی زمانے میں ہوس کی جو ہوا تھی

تھے اُس میں بہ تفصیل وہ احوال سراسر
اور تھی رقم اک اک کے اعمال سراسر

اُس نامہ پہ جب خواجہ قناعت نے نظر کی
اور دیکھی یہ روداد بنی نوع بشر کی

آزردہ ہوا درد محبت کے سبب سے
مُنہ پھیرا سوئے دست چپ اکبار غضب سے

اس طرح سے گرجا کہ ہو جوں ابر گرجتا
یا شیر کہ ہو درد سے بے صبر گرجتا

معلوم ہوا تھا جو کچھ اخبار میں اس کو
بھیجا ملک القدس کے دربار میں اس کو

پر لوگوں کی نیت تھی جو دیکھی ہوئی اُس نے
اس واسطے اک آپ بھی عرضی لکھی اُسنے

تحریر کئے اس میں جو تھے حال یہاں کے
اور جن میں تھے آلودہ بد اعمال یہاں کے

لکھا کہ ہے عالم میں عمل بوالہوسی کا
ایمان ٹھکانے نہیں دنیا میں کسی کا

دیتے مری نیکی کا بدی ہیں صلہ مجھ کو
اور کہتے ہیں بے ہمت و بے حوصلہ مجھ کو

ہے ان کو ہوس طوق بگردن کئے پھرتی
کُتّے کی طرح سب کو ہے دَر دَر لئے پھرتی

آنکھوں پہ لیا سر پہ جو آیا کوئی ٹکڑا
پر صبر و قناعت کا نہ پایا کوئی ٹکڑا

ہیں خواری و زاری کے لئے سارے حق اُس سے
اے کاش قناعت کا بھی لیتے سبق اُس سے

ایسے بھی ہیں اکثر کہ ہیں افلاس سے مرتے
دن رات پڑے ہیں الم و یاس سے مرتے

محنت سے جو برگشتہ ہے نیت ہوئی اُنکی
اور حد سے ہے گذری ہوئی بے ہمتی اُنکی

ہیں خانہ نشیں ہیں وہ مکڑی کا نمونہ
تن ہو گئے ہیں سوکھ کے لکڑی کا نمونہ

تنتے ہیں خیالوں کے سدا تار گھروں میں
دن رات پڑے رہتے ہیں بیکار گھروں میں

جب دیکھو اپاہج کی طرح خوار ہیں گویا
جیتے ہوئے ایسے ہیں کہ مُردار ہیں گویا

اور ایسے بھی کچھ ننگ خلائق ہیں جہاں میں
جو تن کو لٹے بیٹھے ہیں راحت کی اماں میں

پر دل میں سدا کام سے ہیں جان چُراتے
اور جان کے پردے میں ہیں ایمان چُراتے

ہیں رنگ فقیری کا جمائے ہوئے بیٹھے
اور دام دغا اُس میں لگائے ہوئے بیٹھے

وہ تارکِ دنیا نہیں عقبیٰ کی غرض سے
دنیا کو ہیں چھوڑے ہوئے دنیا کی غرض سے

ظاہر میں فقط زہد کی تصویر ہیں گویا
دل دیکھو تو شیطان کے بھی پیر ہیں گویا

ہے چاٹ زباں کو جو لگی مفت خوری کی
پروا ہے اب اُنکو نہ بھلے کی نہ بُری کی

جو کچھ ہو نہ کرنا یہ بد انجام ہیں کرتے
اور نام مرا مفت میں بدنام ہیں کرتے

حالات جہاں سارے کئے جب رقم اس نے
تب کی یہ رقم مہر زبانِ قلم اس نے

یعنی یہاں رہنا مجھے منظور نہیں ہے
اور آپ کا دربار بھی کچھ دور نہیں ہے

بُلوائیں تو بندہ ابھی اک آن میں آئے
واں آؤں تو پھر جان مری جان میں آئے

یہ حال میں اپنے ہوں گرفتار ہمیشہ
خواری میں جو خوش ہیں رہیں خوار ہمیشہ

دیکھا ملک القدس نے حال اہلِ جہاں کا
اور حال کھلا اُن کے ہر اک رازِ نہاں کا

فرمایا اُسی وقت کہ دربار ہو قائم
اور اُس میں اک آئینہ اسرار ہو قائم

مخلوق کہ ہیں خاص سے تا عام جہاں میں
جاری ہوں اسی دم انہیں احکام جہاں میں

تا جملہ زن و مرد سے لے پیر و جواں تک
ہیں ہو چکے آفاق میں اور ہونگے جہاں تک

سب آ کے حقیقت سرِ دربار دکھائیں
اور یاں انہیں آئینۂ اسرار دکھائیں

تا جوہرِ اصلی جو ہر اک دل میں نہاں ہوں
آئینہ میں وہ صورتِ آئینہ عیاں ہوں

جس دم یہ دیا حُکم جہاندارِ جہاں نے
مشہور کیا خلق میں شہرت کی زباں نے
یہاں سُنتے ہی کل خاص سے تا عام تھے جتنے
ارواح سے تا عالمِ اجسام تھے جتنے
جو جو کہ تھے مخلوق خدا نیک سے بد تک
اور ہو چکے یا ہونگے ازل تا بہ ابد تک
تحفے لئے ہاتھوں میں دل و جاں کے حاضر
دربارِ مقدس میں ہوئے آن کے حاضر
بیٹھا ملک القدس بہ اورنگِ عدالت
چھایا ہوا آفاق میں تھا رنگِ عدالت
آئینہ کہ جوں شیشۂ افلاک تھا روشن
یا اہلِ صفا کا وہ دلِ پاک تھا روشن
پرتو فگن اُس میں تھے جو بازار حقیقت
کھُلتے تھے پڑے خلق کے اسرار حقیقت
دربار میں یکبار مُنادی نے ندا دی
اور گوش عقیدت میں وہیں سب کو سُنا دی
یعنی کہ بترتیب ہر اک فرقہ جُدا ہو
اور سامنے آئینہ کے حاضر بہ صفا ہو
دنیا میں کسوٹی ہے وہ ہر کھوٹے کھرے کی
اور دیتا خبر ہے تہ دل سے بھی پرے کی
جس شخص کی تصویر کہ اُس میں اُتر آئے
باطن کی جو حالت ہے وہ ظاہر نظر آئے
اک فرقہ یکایک ہوا دربار میں حاضر
اور پہلے ہوا معرضِ اظہار میں حاضر
خوشحال بھی تھے اور زدہ احوال بھی اُن میں
تھے حادثۂ دہر کے پامال بھی اُن میں
پر چتر لگائے تھا وقار اُن کے سروں پر
دولت کھڑی ہوتی تھی نثار انکے سروں پر
بھوکے بھی جو تھے اُن میں تو جی سیر تھے اُنکے
آہو شکمی نے کئے دل شیر تھے اُن کے
خالی تھی سبب سے نہ یہ آہو شکمی بھی
اک بات میں تھی اُنکو قناعت کی کمی بھی
یعنی کہ بظاہر تھے شکم وصل کمر میں
جس سے کہ سبک تھے کس و ناکس کی نظر میں
بھوکے تھے مگر فضل و کمالات کے سارے
محتاج اگر تھے تو اسی بات کے سارے
دیکھے ملک القدس نے جب حال سبھوں کے
آئینہ ہوئے جوہر اعمال سبھوں کے

اعزاز دوامی کے دئے تاج بھی اُن کو ۔ اور ملکِ قناعت کے دئے باج بھی اُن کو
تا اہلِ جہاں میں رہیں ممتاز ہمیشہ ۔ اور رہویں زمانہ میں باعزاز ہمیشہ
بعد اس کے گروہ اور اک آتا نظر آیا ۔ اور اُس میں تماشہ یہ نظر طرفہ تر آیا
آئے بہ ہوس سب سے قدم مار کے آگے ۔ پر پہنچے جب آئینۂ اسرار کے آگے
سر تا بہ قدم عکس ہوئے جلوہ گر اس میں ۔ اس طرح کے آئے وہ نظر جانور اُس میں
جن کے بدنوں پر نہ دہن تھے نہ گلے تھے ۔ کھانے کے لئے سارے شکم ہو کے ڈھلے تھے
ملتی تھی نہ وہ شے کہ قناعت کریں جس پر ۔ مانند مگس تھے کبھی اس پر کبھی اُس پر
تھے خواری و رسوائی میں دن کاٹتے پھرتے ۔ اور ہونٹ تھے کتے کی طرح چاٹتے پھرتے
پر ولولۂ حرص نہ ہوتے تھے کم اُن کے ۔ غربال کی صورت تھے نہ بھرتے شکم اُنکے
کچھ لوگ عجب رنگ دکھاتے ہوئے آئے ۔ اور اپنے تماشے پہ ہنساتے ہوئے آئے
راحت طلبی اُن کو گرانبار تھی کرتی ۔ اور زندگی اس طرح سے مردار تھی کرتی
ہِل کر اُنہیں جانا تھا کہیں گور کا جانا ۔ یا قیدِ مشقت کی طرف چور کا جانا
آنے میں بھی تھے جان چُرائے ہوئے آتے ۔ لوگ اُن کو تھے کاندھوں پہ اُٹھائے ہوئے آتے
القصہ وہ جب بیچ میں دربار کے آئے ۔ اور سامنے آئینۂ اسرار کے آئے
تھے سانڈھ کہ سر ڈال کے ناچار کھڑے تھے ۔ اور کرتے جُگالی سرِ دربار کھڑے تھے
پردے میں قناعت کے وہ تھے تیر لگاتے ۔ اور دامِ دغا تھے پئے نخچیر لگاتے
ظاہر میں بڑی تمکنت و شان سے آئے ۔ لیکن نظر آئینہ میں شیطان سے آئے
روباہ کی صورت نظر آتے تھے وہ سارے ۔ گرگٹ کے گر رنگ دکھاتے تھے وہ سارے
جس خانۂ دل میں یہ طلسمات عیاں تھے ۔ اور آئینۂ حالات و خیالات جہاں تھے

اس طرح کا گھر خلق میں سوچو تو کہاں ہو
حیراں ہوں کہ وہ خانۂ دل ہو تو کہاں ہو
بند آنکھیں کئے کیوں پھرے اک ایک کے گھر تو
اپنے ہی جیب دراست ذرا غور تو کر تو
پہلو میں کہیں تیرے نہ وہ خانۂ دل ہو
آزاد وہ اپنا ہی نہ کاشانۂ دل ہو

شرافتِ حقیقی

میں پوچھتا نہیں ہرگز تمہارا نام ہے کیا
نہ یہ کہ نام بزرگوں کا اور مقام ہے کیا
نہ خانوادہ سے مطلب نہ خانماں سے غرض
یہاں تو نام سے کچھ ہے نہ ہے نشاں سے غرض
تمہارے کام گر اچھے تو نام اچھے ہیں
گھرانے اچھے۔ گھر اچھے۔ تمام اچھے ہیں
جہاں کی دولت و حشمت کا یاں خیال نہیں
امیر ہو کہ فقیر۔ اس سے کچھ سوال نہیں
کوئی امیر اگر ہے تو اپنے گھر بیٹھے
بزرگ صاحبِ زر تھے تو لے کے زر بیٹھے
یہاں تو مایۂ ہمت ہیں جو زیادہ ہے
بزرگ امیر ہے اور خود امیرزادہ ہے
مجھے نہیں ہے یہ پروا کہیں سے آئے کوئی
کہیں سے بار توطن اُٹھا کے لائے کوئی
جو پاک نہر ہے اور آب صاف چلتا ہے
تو کیوں یہ پوچھیں کہ چشمہ کہاں نکلتا ہے
درخت سے نہیں کچھ کام جس کے پھول ہو تم
کمالِ اصل تو جب ہے کہ با اصول ہو تم
عدم سے آن کے کس خاک پر گرے پہلے
وہ کیا زمین تھی کہ جس پر قدم پھرے پہلے
گذارا تم نے لڑکپن ہے قصرِ شاہی میں
کہ جھونپڑوں میں پلے خواری و تباہی میں
مجھے نہ فخر ہے اس کا۔ نہ عار ہے اس کی
اگر تلاش ہے تو بار بار ہے اس کی
کہ رکھتے ملکِ مروت میں رسم و راہ ہو کیا
دکھاتے ہمتِ عالی میں دستگاہ ہو کیا

میں پوچھتا نہیں تاجر کہاں سے ہے آیا
گماشتہ ہے کہ رکھتا ہے گھر کا سرمایا

نہیں تلاش کہ لایا ہے ساتھ کیا چیزیں
سُبک سُبک ہیں وہ یا ہیں گراں بہا چیزیں

میں چاہتا نہیں ارزاں یہ شے دِلا دو مجھے
خدا کے واسطے اتنا کوئی بتا دو مجھے

متاعِ حُسنِ دیانت دُکاں میں ہے کہ نہیں
وفا کی جنس بھی اس کارواں میں ہے کہ نہیں

یہ میں نے مانا کہ باعقل و ذی شعور ہو تم
مقامِ تجربہ کاری میں پہنچے دور ہو تم

نہ کچھ مقدرہ فہمی سے رکھتا کام ہوں میں
نہ کرتا ضابطہ دانی میں کچھ کلام ہوں میں

پر اُس کو خود غرضی میں نہ خرچ کرنا تم
کسی کے خون میں ناحق نہ ہاتھ بھرنا تم

زیادہ عقل زیادہ خراب کرتی ہے
ثواب ہائے خدا کو عذاب کرتی ہے

مجھے غرض نہیں کالج میں تم پڑھے کہ نہیں
جماعتوں کے مدارج پہ تم چڑھے کہ نہیں

کتابیں پڑھ کے جو کیں حفظ بر زبان تو کیا
اور اُن میں پاس ہوئے دے کے امتحان تو کیا

تمہارے خلق پہ بھی کچھ اثر ہوا کہ نہیں
زباں سے کہنے کی دل تک گئی صدا کہ نہیں

فقط جو عالمِ ذی شان ہو گئے تو کیا
مرے حسابوں وہ شیطان ہو گئے تو کیا

جو کچھ کہ مُنہ سے کہو اُس کا لو اثر دل میں
کہ ہے کتابوں میں جو کچھ۔ کرے وہ گھر دل میں

زبان و دل میں بہم جبکہ ایک ہو جاتے
تو آدمی بھی ہیں بالطبع نیک ہو جاتے

وگرنہ پڑھنے کو سب خاص و عام پڑھتے ہیں
ہزاروں طوطے ہیں کلمہ کلام پڑھتے ہیں

جو مجھ سے پوچھو تو ہے پھر بھی ناتمام وہ علم
تمام جب ہو کہ پہنچائے فیضِ عام وہ علم

وہ علم۔ جس سے کہ اوروں کو فائدہ نہ ہوا
ہمارے آگے برابر ہے وہ ہوا نہ ہوا

مجھے غرض نہیں سب کچھ ہو تم۔ کہ کچھ بھی نہ ہو
مگر یہی ہے تمنا کہ ایسے ہو کے رہو

میاں جلسہ جو آزاد پوچھے آکے کبھی
کہو۔ کسی میں لیاقت ہو گر یہ کہنے کی

کہ باصفا و سبک روح و پاک جاں ہم ہیں
تو تم جواب میں جھٹ بول اُٹھو کہ ہاں ہم ہیں

نوطرزِ مرصّع

اُولوالعزمی کے لئے کوئی سدِّ راہ نہیں

اقبال اک برس جو مرا تاج سر ہوا
جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
دامانِ کوہسار میں سورج بھی لیٹ کر
دیکھو جو گھر تو سب درودیوار تھے سفید
پتّے تھے آ کے جاڑے نے سب دور کر دئے
اک رات بیٹھے بیٹھے جو میں تنگ آگیا
دیکھا کہ دوڑا جاتا ہے اِک تازہ نوجواں

شملہ پہ مجھ کو موسمِ سرما بسر ہوا
اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے
دبکا لحاف ابر میں منہ کو لپیٹ کر
باہر چلو تو دامن کہسار تھے سفید
اور تھے درخت برف نے بلور کر دئے
گھر سے نکل کے آگے ٹہلتا چلا گیا
ہمّت کے ہاتھ میں ہے اُٹھائے سپہ نشاں

ہے اُس پہ روشنی سے لکھا ہاں بڑھے چلو!

ہمّت کا اُسکی حال میں لکھ کر سناؤں کیا
جاتا تھا نوجوان عجب آن بان سے
چلتا قدم اُٹھائے تھا اور سر جھکائے تھا
کیا جانے فکرمند تھا یا کیا ملال تھا
سینے میں نعرہ بند تھا منہ میں نہ تھی صدا

کاغذ کے کوزے میں کہو دریا کو لاؤں کیا
پیدا شکوہ و شان تھی اُسکے نشان سے
گویا خروش و جوش کو دل میں دبائے تھا
تیور بگڑ رہے تھے کچھ ایسا خیال تھا
لیکن خموشی اُسکی باواز کرتا

دیتی تھی ہر قدم پہ صدا ہاں بڑھے چلو!

وہ آگے آگے جاتا تھا میں ساتھ ساتھ تھا
دامن تھا اُس کے شوق کا اور میرا ہاتھ تھا

جو آکے خود سیاہیٔ شب راہ پر پڑی
آبادی ایک شہر کی ہم کو نظر پڑی

خوشحال گھر اور اُن میں خوشی بولتی ہوئی
باتیں۔ کہ غم سے دل کی گرہ کھولتی ہوئی

گھر گھر اُجالے تھے سر دیوار سامنے
دروازوں سے چراغ نمودار سامنے

تھے ہر طرف سے جاڑے کے ساماں پکارتے
تارے بھی اک کنارے سے تھے آنکھ مارتے

آرام کہ رہا تھا کہ آگے نہ جا نہ جا
اور میں بھی کہ رہا تھا کہ سچ سچ بجا بجا

سمجھانے والے سب یونہیں سمجھا کے رہ گئے
اتنا بھی وہ نہ سمجھے کہ ہیں کیا یہ کہ رہے

پر چپکے سے گر کہا تو کہا ہاں بڑھے چلو!

پھیرا تھا منہ ابھی نہ شب تیرہ فام نے
اک پیر مرد تجربہ کار آیا سامنے

پیری کی برف نے تھا اُسے تن بدن دیا
موئے سفید نے نمدی پیرہن دیا

بولا کہ اے جوان عجب کالی رات ہے
اور وقت وہ کہ رات ہے یا حق کی ذات ہے

سنسان جنگل اور یہ درختوں کی سائیں سائیں
چاروں طرف پہاڑ ہیں ہیں دوڑتی بلائیں

طوفان برف سر پہ کھڑا ہے تُلا ہوا
ہے یہ درہ کہ موت کا مُنہ ہے کھُلا ہوا

مانا کہ لطف عیش و طرب پر نظر نہیں
جانا کہاں ہے جان کا بھی تجھ کو ڈر نہیں

یہ سُن کے نکلا شعلۂ دل نوجوان سے
گویا ستارہ ٹوٹ پڑا آسمان سے

اور اس نے دی کڑک کے صدا ہاں بڑھے چلو!

تھی رات رنگ ابھی رخِ عالم پہ پھیرتی
گہ مشک اُڑاتی تھی گہے عنبر بکھیرتی

کیا جانیے ہم نکل کے کدھر کے کدھر گئے
دیکھا کہ جاڑے زور سے اپنے اتر گئے

موسم بھی معتدل ہے ہوا ہے لہک گئی — خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی
اور جانور ہیں رات کی آواز دے رہے — مل جل کے ساتھ جیسے ہوں دمساز دے رہے
پانی کی ہیں پہاڑ سے آوازیں آ رہیں — جو زیر و بم کی دور سے ہیں سُر ملا رہیں
ناگاہ آئی ایک پریزاد سامنے — کی رمز گل سے بلبلِ رنگیں کلام نے
جاتے ہو ایسے وقت میں کس کام کے لئے — آرام کیجے رات ہے آرام کے لئے
دیکھا پری کو اُس نے نگہ چشم ناز سے — اور پاس ہو کے نکلا عجب سوز و ساز سے

پھر اتنا مسکرا کے کہا ہاں بڑھے چلو!

ناگہ فلک پہ دامنِ شب چاک ہو گیا — لبریز نور سے طبقِ خاک ہو گیا
مُنہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا — گلگونہ لے کے سامنے رنگِ شفق ہوا
روئے سحر پہ شان تھی نور و ظہور کی — چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گلِ تر کی لالیاں — اور اوس سے بھری ہوئی پھولونکی پیالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا — اور جھوم جھوم کر وہ رخِ گُل کا چومنا
سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی — شبنم تھی آ کے رات کو موتی لٹا گئی
پانی وہ صاف صاف جو بل کھا کے جاتے تھے — پارے کے سانپ گھاس پہ لہرا کے جاتے تھے
سورج نے سر نکالا یکایک پہاڑ پر — بولا جوان شیر کی صورت دہاڑ کر

آرام کی نہیں ہے یہ جا۔ ہاں بڑھے چلو!

تبدیل جب کہ دھوپ سے رنگِ سحر ہوا — اک مدرسہ کے آگے سے اُس کا گذر ہوا
تھا پاس اک خرابۂ مسجد پڑا ہوا — مُلّا تھا اُس میں بر سرِ ممبر چڑھا ہوا
تھا ہر طرف کو دامنِ تقریر کھینچتا — اور دوزخ و بہشت کی تصویر کھینچتا

حور و قصور پر تھا دلوں کو لبھا رہا
دوزخ دکھا کے خلق خدا کو ڈرا رہا

تھے لوگ اُس کی باتوں پہ مدہوش ہو رہے
اور معتقد تھے سب ہمہ تن گوش ہو رہے

دیکھا جو نوجوان کو اُس مرد پیر نے
اپنی لکیر پیٹی پُرانے فقیر نے

یعنی کہ آؤ خلد کا نقشہ دکھائیں ہم
بیٹھو کہ تم کو عرش کے اوپر اُڑائیں ہم

بولا جواں کہ اب وہ زمانے گذر گئے
وہ رات ہو چکی وہ فسانے گذر گئے

اور سب سے پھر اشارہ کیا ہاں بڑھے چلو!

ملکِ فنا اگرچہ بہت بے ثبات ہے
بے پا و بے مدار ہے جو اس کی بات ہے

لیکن بجا کہا جو کسی نے کہا ہے یہ
ہمّت کے معرکوں کے لئے خوب جا ہے یہ

پر دیکھتا جو ہوں تو یہاں طرفہ حال ہے
مطلق ادھر نہیں کوئی کرتا خیال ہے

دن رات ہے امیروں کو آرام سے غرض
ساقی سے مدعا ہے و یا جام سے غرض

باقی فلک زدوں کا تو پھر کیا ٹھکانہ ہے
افلاس ان کے واسطے پہلا بہانہ ہے

اور جو کہ رکھتے ہمت و غیرت ہیں کام ہیں
محنت سے پیٹ پال رہے صبح و شام ہیں

لڑکے وظیفوں پر ہیں سبق یاد کر رہے
تنخواہوں پر ہیں محنتیں استاد کر رہے

پھرتے فقیر مانگتے در در ہیں صبح و شام
کہتے ہیں بار بار کہ دے جا خدا کے نام

آزاد کی یہی ہے صدا ہاں بڑھے چلو!

جغرافیۂ طبعی کی پہیلی

جو منشی ذکاء اللہ صاحب پروفیسر زبان ہائے مشرقی کی فرمائش سے نظم کی گئی

ہنگامۂ ہستی کو
گر غور سے دیکھو تم

ہر خشک و ترِ عالم صنعت کے تلاطم میں
جو خاک کا ذرّہ ہے یا پانی کا قطرہ ہے
حکمت کا مرقع ہے جس پر قلمِ قدرت
انداز سے ہے جاری اور کرتا ہے گلکاری

اِک رنگ کہ آتا ہے
سو رنگ دکھاتا ہے

اور دیکھنے والوں کی آنکھیں تو کھلی ہیں پر
خرمہرۂ رنگیں - یا بلّور کے ٹکڑے ہیں
ہر لحظہ و ہر ساعت قدرت کے تماشے ہیں
عالم میں پڑے ہوتے پر اُن کو نہیں پروا

ہرگز کہ یہ سب کیا ہے
اور ہے تو سبب کیا ہے؟

ایسے بھی مگر اکثر ارباب بصیرت ہیں
جو کھولے ہوئے ہردم ہیں دیدۂ عبرت کو
ذرّہ ہو کہ ہو سورج معنی ہو کہ ہو صورت
ہر جلوہ قدرت میں سرمہ انہیں حکمت کا
سرمایۂ بینائی اور عینکِ عبرت ہے
یہ آنکھ پہ ٹھیک آئی جس سے کہ زمانے کی
گرمی ہو یا سردی یا ہووے تری خشکی

حکمت کا معما ہے　　قدرت کی پہیلی ہے
نقطہ ہے اگر اُس میں　　ہے عقدۂ سربستہ

عقدہ ہے اگر اس میں
ہے نکتۂ برجستہ

اک سیدھی سی بات اس وقت　　آئی ہے تصوّر میں
وہ یہ ہے کہ دو چیزیں　　کیا ایسی ہیں دنیا میں
آپس میں جو رکھتی ہیں　　پیوندِ زنا شوئی
اولاد سے جن کی سب　　آباد زمانہ ہے
نقلی نہیں افسانہ　　سب نے اسے مانا ہے
اور پھر انہیں دونوں کو　　دیکھو جو نظر بھر کر

ماں بیٹی کا ہے ناتا
دونوں میں نظر آتا

شورش گہِ عالم میں　　پیدائشیں لاکھوں ہیں
اصلوں کی بہت نسلیں　　رشتوں کے سررشتے ہیں

اس پیچ کا پر رشتہ
دیکھا نہ سُنا کوئی

آزاد۔ بھلا ہے کون　　جو آگے ترے بولے
یا بندِ گرہ کھولے　　ہاں یہ کہ مگر تو بھی

کہ سُن کے سوال اپنا

دے آپ جواب اپنا

وہ دو کہ بہم جن میں | ہے عقد زن و شوہر
عالم میں ہیں دو جوہر | خشکی و تری جن سے
صنعت گہِ قدرت میں | پیدا و ہویدا ہیں

سب عالم جسمانی
حیوانی و انسانی

اور دوسرے رشتہ سے | گر غور کرو دل میں
تو دیکھ لو پانی کو | جس رنگ میں جی چاہے
بادل ہو کہ باراں | قطرہ ہو و یا دریا
شبنم سے بھی کم ہووے | یا نام کو نم ہووے
اِک عرصۂ خاص اُس پر | گذریگا تو دیکھوگے
خشکی کے نشاں ہوتے | اس میں سے ہویدا ہیں

یا بچے ہیں جو ماں کے
آغوش میں پیدا ہیں

کیوں قبلۂ من دیکھا! | یہ طرفہ معمّا ہے
کیا بوجھے کوئی پنڈت | یا فلسفی و مُلّا
ہاں سمجھے میاں آزاد | یا منشی ذکاءاللہ
سنبل ہے یہ سبزہ میں | پھولوں میں چنبیلی ہے

کون اس کو بھلا بوجھے

حکمت کی پہیلی ہے

جسے چاہو سمجھ لو

قلم مرقعِ عبرت نیا دکھاتا ہے
اور ایسے شخص کا اک ماجرا سناتا ہے

کہ سب تمہارا سا تھا کارخانہ اس کے لئے
یہی زمیں تھی یہی تھا زمانہ اس کے لئے

فنا کے سایہ میں کرتا وہ زندگانی تھا
جو پوچھو کون - تو سمجھو تمہیں سا فانی تھا

مٹایا گردشِ گردوں نے آہ نام اُس کا
نہ آج نام ہے اُس کا نہ کچھ مقام اُس کا

پر اتنا سچ ہے کہ غمگین و شاد ہونے سے
خوشی کے ہنسنے سے اور درد و غم کے رونے سے

کبھی امید سے اور گاہ ناامیدی سے
کبھی خطر کی خبر - گاہ خوش نویدی سے

جو ایک رنگ تھا آتا تو ایک جاتا تھا
خیال اس کا مرقع نیا بناتا تھا

یہ دل جو سینے میں جنبش ہے دمبدم کرتا
کہ ہے اسی پہ ہر اک زندگی کا دم بھرتا

دماغ میں جو خیالوں کا آنا جانا ہے
کوئی یقیں ہے کوئی وہم کا فسانہ ہے

ہماری ہمتِ عالی کا اوج پر جانا
کبھی بہ جبر کبھی خود بخود اُتر آنا

غرض اُٹھاتا یہ کیفیتیں ضرور تھا وہ
کہ آخرش یہی انسانِ باشعور تھا وہ

جو تم ہو دیکھ رہے وہ یہ سب ہے دیکھ چکا
جہاں کے شام و سحر روز و شب ہے دیکھ چکا

جو کچھ کہ سہتے ہو تم آج سہہ چکا ہے وہ
جو کچھ کہ آج ہو تم ایسا رہ چکا ہے وہ

مگر میں کیا کہوں مجھ کو تو اب یہ رونا ہے
کہ جو وہ آج ہے اک دن وہ تم کو ہونا ہے

یہ روز و شب کہ مہ و سال کے حساب میں ہیں
یہ سال و ماہ جو موسم کے انقلاب میں ہیں
بہت سے میوے بہت سے اناج دیتے ہیں
بہار میں سر سبزہ کو تاج دیتے ہیں
یہ فرش خاک کہ سب کاروبار ہیں جس پر
یہ ابر و باد کہ سارے مدار ہیں جس پر
جب اس کے طوق گلو زندگی کا قصہ تھا
تو ساری محنتوں سے لیتا اپنا حصہ تھا
یہ سب کچھ اب بھی ہے پر اُسکو کچھ خبر بھی نہیں
جو ہو تو نفع نہیں گر نہ ہو ضرر بھی نہیں
بلا سے اس کی زمانہ ابھی فنا ہو جائے
و یا کہ ملک فنا گلشنِ بقا ہو جائے

وہ آپ جب نہ ہوا پھر جہاں ہوا نہ ہوا
زمیں ہوئی نہ ہوئی آسماں ہوا نہ ہوا

یہ صبح و شام جو ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں
یہ سال و ماہ کی فصلیں جو آتی جاتی ہیں
یہ مہر و ماہ کہ جن سے جہان روشن ہے
ستارے جن سے زمین آسمان روشن ہے
کسی ہیں دور کا اسکے نشاں نہیں باقی
پتا تلک بھی تہِ آسماں نہیں باقی

قضا نے لے کے الٰہی کہاں چھپایا اُسے
زمین کھا گئی یا آسماں نے کھایا اُسے

کسی کے حسنِ پریوش کا وہ دیوانہ تھا
اور اُس کے تیرِ ادا کا ہوا نشانہ تھا
پر اب جو دیکھو تو وہ غیرتِ پری بھی نہیں
وہ اس کے ناز وہ اندازِ دلبری بھی نہیں
فنا کے بزم میں ساقی نے اُسکو جام دیا
مرض کا نام کیا۔ موت کا پیام دیا
طبیب آتے تھے لیکن کوئی دوا نہ چلی
خود آیا حسن سفارش کو پر ذرا نہ چلی ۷۷

فلک نے موت کا جام آخرش پلایا اُسے
دہانِ گور سے گویا زمیں نے کھایا اُسے

ازل کی صبح کہ جس میں جہاں ہوا پیدا
اور اس کے ساتھ ہی گویا ہوئی فنا پیدا
کتاب عمر جہاں آج تک پڑھی میں نے
ورق ورق ہے یہ تاریخ دیکھ لی میں نے
ہر اک کا راز ہے اُس میں کہیں کہیں کھلتا
پر اس غریب کا احوال کچھ نہیں کھلتا

بہت ہوں فکر سے کہتا کہ کچھ بتا تو سہی
ہے وہ بھی اتنا ہی کھلتا کہ کوئی تھا تو سہی

تارے کا عاشق

اک سخنور کسی تارے کا تماشائی تھا
اس کے دیدار کا دلدادہ و شیدائی تھا
دل سے وہ چاند کا ٹکڑا اُسے بھایا ہوا تھا
اور وُہی رات دن آنکھوں میں سمایا ہوا تھا
وہ ستارہ کہ ہوا آنکھوں کا تارا تھا اُسے
چشم حیرت کے نظارے کا سہارا تھا اُسے
اوجِ معنی سے مضامیں تھا اُتارا کرتا
اور انہیں اپنے ستارے پہ تھا وارا کرتا
چشم حیرت سے نظر اس پہ سدا کرتا تھا
دل کے سب راز و نیاز اس سے ادا کرتا تھا
غم جو اک شب اُسے بے تاب و تواں کرنے لگا
مُنہ ہی مُنہ میں یہ سخن اُس سے بیاں کرنے لگا
ہے تو تُو رشکِ پری غیرتِ صد حور ہے تو
مگر اس عاشقِ دل دادہ سے کیوں دور ہے تو
مُنہ ترا مہر صفت ہے گا دمکتا پیارے
سرد مہری سے مگر کیوں ہے جھپکتا پیارے
اسے وہ تو جس پہ کہ قابو کی کوئی بات نہیں
چشم حسرت کے سوا حرف و حکایات نہیں

ہیں جو ارماں بھرے دل میں نکالوں کیونکر
ہائے چھاتی سے تجھے اپنے لگالوں کیونکر

دم نکل جائے تو ہو یار مبارک مرنا
ایسا مرنا تو ہے سو بار مبارک مرنا

اپنے تارے کو جو حسرت سے یہ تکتا تھا پڑا
جام دل جوش محبت سے چھلکتا تھا پڑا

آدمیت اُسے تب اسکے خیالات نے دی
دفعتہً جنبش ادھر شوق ملاقات نے دی

بن کے عورت کششِ عشق کی ماری آئی
آسماں چھوڑ زمیں پر وہ بچاری آئی

بولی پھر اس سے کہ اے شاعر شیدا میرے
شوق دیدار تھے دل میں ترے کیا کیا میرے

تو ہے وہ عاشقِ شیدا کہ مجھے پا ہی لیا
تیرے ارمانوں نے افلاک سے بلوا ہی لیا

کیا تجھے صورتِ عورت میں ہوں لگتی اچھی
یا کرن تارے کی ہو کر ہوں چمکتی اچھی

سُنی شاعر نے جو یہ بات تو شرمایا بہت
بلکہ شرمایا نہیں جتنا کہ پچھتایا بہت

بولا افسوس وہ تارا جو اُڑاتا تھا مجھے
اوج افلاک پہ کھینچے لئے جاتا تھا مجھے

آج وہ نور فلک ہاتھ سے کھویا میں نے
بولی وہ اپنا بھی کام آج ڈبویا میں نے

تو نے گردوں پہ چمکتا ہوا تارا کھویا
میں نے یاں عاشقِ شیدا سخن آرا کھویا

مبارکباد جشن جوبلی

اے خوشی آ۔ ترے آنے سے زمانہ روشن
آ کہ تو آپ ہے روشن۔ ترا آنا روشن

اے خوشی آ۔ ترے آنے سے ہے گھر گھر شادی
ہے ترے آنے سے ہر لب پہ مبارکبادی

یاد میں بیٹھے تھے یارانِ دل آگاہ تری
سالہا سال سے تھے دیکھ رہے راہ تری

ہم خوشی اس کو نہیں کہتے جو ہر سال آئے
خلعت عید میں ہنستی ہوئی خوشحال آئے

کبھی عید رمضاں ہو۔ کبھی عید قرباں
ہاتھ پھیلائے گلے ملتے ہوں بڈھوں سے جواں

عیدیاں بانٹ کے بچوں کے جو دل شاد کرے
ہول و ہنگامہ سے بازاروں کو آباد کرے

خوشی اس کو بھی نہیں کہتے کہ جو نوروز سے ہو
گل و گلشن کے لئے جشن دل افروز سے ہو

سبزہ و گل میں عیاں عالم نیرنگ کرے
خاک کو سبز کرے سبزہ کو گلرنگ کرے

وہ خوشی کیا کہ ہو رخ جس کا فروزاں شب کو
اور دوالی سے کرے جشن چراغاں شب کو

جابجا ساتھ کھلونوں کے مٹھائی بانٹے
کہیں آنہ۔ کہیں پیسہ۔ کہیں پائی بانٹے

خوشی اس کو نہیں کہتے جو کرے نام سے خوش
امتحاں لے کے کرے بچوں کو انعام سے خوش

وہ خوشی کیا کہ جو گھر بیٹھ کے ہم آپ کریں
ہر برس سالگرہ بچوں کی ماں باپ کریں

ہے حقیقت میں خوشی وہ کہ بافضال خدا
ہند پر قیصرۃ الہند ہوں فرماں فرما

جب باقبال و حشم گذریں ایسے سال پچاس
جابجا جشن خدا سازکے ہوویں اجلاس

ہووے لاہور میں دربار نشاط و شادی
اور پڑھے آن کے آزاد مبارک بادی

یہ خوشی وہ ہے کہ دل جس سے ہیں خنداں خنداں
یہ خوشی وہ ہے کہ ہو عید بھی قرباں قرباں

ہوئی مشہور زمانے میں جو یہ خوشخبری
گھر بہ گھر دل کی امیدوں نے ہے کی جلوہ گری

کہیں ساماں ہیں۔ کہیں بے سر و ساماں خوش ہیں
یہ خوشی وہ ہے کہ ہندو و مسلماں خوش ہیں

رات درگاہ الٰہی میں دعا کرتے ہیں
دن کو پھرتے ہیں تو شکرانے ادا کرتے ہیں

ان میں ہے بندۂ آزاد یہ کہتا بہ نیاز
حضرت قیصرۃ الہند کی ہو عمر دراز

ان کے فرزند سدا خرم و دل شاد رہیں
ان کی اولاد سے آبادیاں آباد رہیں

جاری اس جشن مبارک کا سدا دور رہے
روش گردش دولاب یہی طور رہے

مثنوی یاد الٰہی

آؤ آزاد کیا ہو خموش
فصل گل آئی ہے بجوش و خروش

کیا پڑے کنج غم میں ہو بیکار
گل و گلشن کی چل کے دیکھو بہار

لطف صحبت بہم غنیمت ہے
میاں آزاد دم غنیمت ہے

چل کے دیکھو ذرا چمن کی سیر
گل و گلزار یاسمن کی سیر

گرچہ بہرِ عوام کالانعام
لطفِ گلگشت ہو گیا بدنام

پر کرو دل میں تم جو اپنے غور
ہے ہر اک امر کا علیحدہ طور

نیک و بد پر اگر نظر ہے شرط
قصد کا اپنے بھی اثر ہے شرط

سیکڑوں چیزیں اس جہاں میں ہیں
کہ بُری خلق کے گماں میں ہیں

صرف ہووے گر اسمیں حسن خیال
تو ہو پھر نقص اس کا عین کمال

گل و سنبل سے تا خس و خاشاک
خاک سے تا بہ گلشنِ افلاک

رکھتے ہیں لوگ جو نظر عالی
نہیں عبرت سے کوئی شے خالی

گوش عبرت نہیں تو کھولتا ہے
ورنہ ہر برگ یاں کا بولتا ہے

ہر زباں برگ گوش دل گل ہے
تو ہی مدہوش نشۂ مُل ہے

چشم نرگس چمن کا جوبن تھی
برگ گویا زبان سوسن تھی

ساری ذات و صفات ہے تجھ میں
گل میں جو کچھ ہے بات ہے تجھ میں

کون سی بات تجھ سے چھوٹی ہے
تجھ میں اکسیر تک کی بوٹی ہے

مرہم زخم جان و خاطر ریش
برگ سبز است تحفۂ درویش

ہر خزاں کو بہار لازم ہے — ہست کو نیستی ملازم ہے
ایک دن دل جو میرا گھبرایا — کلبۂ غم سے میں نکل آیا
دل تھا پژمردہ غنچہ وار مرا — ہوا گلزار میں گذار مرا
پھرتے پھرتے جو دل میں کچھ آیا — پا کے اِک جا درخت کا سایہ
بیٹھا میں بر کنارِ آبِ رواں — کہ ہے عمر رواں حبابِ رواں
کی جو یکبار آنکھ اُٹھا کے نظر — برگ اک ٹوٹ کر زِ شاخِ شجر
اُترا اوپر سے جو پیامِ سروش — اور ہوا میری زینتِ آغوش
گرچہ گویا نہ تھی زبانِ مقال — پر وہ کہتا تھا فی لسان الحال
کہ اگر تجھ کو چشم بینا ہے — تو نہ قدرت کی طرح بینا ہے
نہیں مجھ میں ہے یہ رگ و ریشہ — دیکھ ان کو بہ چشم اندیشہ
صانعِ غیب کا ہے کارِ بدیع — کلکِ صنعت کا ہے نگار بدیع
روئے ہستی پہ تھا نہ نام مرا — تھا رگِ شاخ میں مقام مرا
فیض آب اور باد کی نرمی — اس کی نرمی و مہر کی گرمی
مادرِ خاک سے ہوئے دوچار — روح جنبش میں آگئی یکبار
مُنہ کو گردِ عدم سے صاف کیا — سینۂ شاخ کو شگاف کیا
بار مجھ بن نہ زینہار آتا — پہلے برگ آتا پیچھے بار آتا
تاج سر میں لئے نہال ہوا — مجھ سے سارا چمن نہال ہوا
خسروِ گُل کا جب قشوں آتا — میرا پرچم تھا پہلے لہراتا
سب کے سر پر تھا نخل کا سایہ — میرا سایہ تھا نخل پہ چھایا

جس سے سارے جہاں کو راحت تھی
ہر مسافر کو استراحت تھی

شاخ گل تھی ہری بھری مجھ سے
زیب و زینت چمن کی تھی مجھ سے

تھے رفاقت سے میری سرو آزاد
مجھ سے زیبا تھا طرۂ شمشاد

سبز کونپل تھا جب نکالا سر
پر وہ کونپل تھی غیرتِ گلِ تر

کھائی میں نے جو اس چمن کی ہوا
دیا شاخ و شجر کو برگ و نوا

میرا یُمن قدم یہ آیا راس
ہو گیا ہر درخت خضر لباس

زاد و برگِ شجر ہوا مجھ سے
گل کا آباد گھر ہوا مجھ سے

غزلیات

دنیا ہے جب فنا تو فنا ہی سمجھ اسے
پی جام مرگ و آب بقا ہی سمجھ اسے

جو کچھ یہاں لیا ہے وہ رہوگا ست نہیں
پھر لیوے یا نہ لیوے لیا ہی سمجھ اسے

جو کچھ فلک کے نیچے ہے سب گرد باد ہے
پھر جو ہوس ہو دل میں ہوا ہی سمجھ اسے

مہماں سرائے دہر ہو جب منزلِ فنا
پھر جو محل سرا ہے سرا ہی سمجھ اسے

ہے ہر شفا کا جب مرض الموت ختم کار
پھر دے رضا قضا پہ شفا ہی سمجھ اسے

بزمِ فنا میں کچھ نہیں جز نغمۂ فنا
جو کچھ نہیں سُنا ہے سُنا ہی سمجھ اسے

آزاد نے قدم نہ رکھا قیدِ حرص میں
سچ ہے کہ دی خدا نے ہے کیا ہی سمجھ اُسے

غزل

ہمارے نام سے انکو اگر ہے عار تو کیا
جو اپنے نام سے لیں یار انہیں پکار تو کیا

کلام دل ہیں ہے اور دل کے درد مین بلبل
ہزار گل جو چمن میں ہیں دل فگار تو کیا

قرار برکف آزادگاں نگیرد مال
جو ایک پلئے تو کیا اور اڑائے ہزار تو کیا

ہمارا صحنِ دل اور ہے خیال اُس گل کا
چمن میں آئی تو کیا اور گئی بہار تو کیا

گھڑے فلک کی ہیں گردش میں دیکھئے کیا ہو
کوئی گھڑی کو جو یاں ہوگیا قرار تو کیا

فلک کا دور ہے اس ماہ جبیں کی صحبت میں
وہاں چڑھایا تو کیا اور دیا اُتار تو کیا

خدا سنوارتا ہے بیکسوں کی بگڑی کو
کسی کا کام کسی نے دیا سنوار تو کیا

ہم آپ صورتِ حیرت ہیں آئینہ دیکھو
قرار دل کو نہیں۔ ہے ہمیں قرار تو کیا

غزل

گر تصور میں نگارِ خطِ جاناں ہوگا
پھر تو جو خط میں لکھونگا خطِ ریحاں ہوگا

ہاتھ چومینگے مرے گبر و مسلماں دونوں
ایک میں دستِ صنم ایک میں قرآں ہوگا

غنچۂ دل کو مرے توڑ کے خوش ہوتے ہو کیا
وہ ہی گل ہے کہ جو پھولا تو گلستاں ہوگا

دل نہیں ہے تو نہ ہو دیکھو تو سینہ میں ہے کون
مجھ سا دل دادہ بھلا کوئی مری جاں ہوگا

دل ہے اپنا کہ جہاں ہے تو قدم خاک ہے یہ
یا کسی زلف میں ہوگا تو پریشاں ہوگا

بارِ تسلیم ہوا پیش کہ دیکھو اسکو
کون سمجھا تھا اُٹھائیگا تو انساں ہوگا

ذوق کا دل ابھی روتا ہے ابھی ہنستا ہے
زیرِ شبنم کہیں دیکھا گلِ خنداں ہوگا

غزل

کہاں تھی بزم کہ واں یہ نہ دلفگار آیا
تم آئے واں مجھے یاں حیف بار بار آیا

چمن میں کہتے ہیں پھر موسم بہار آیا
کوئی تو یہ بھی زباں سے کہو کہ یار آیا

الٰہی خیر ہو زنداں ہیں خاکسار کی آج
ہوا کے گھوڑے پہ ہے محتسب سوار آیا

صنم نہ دیر میں تو بولا اور نہ کعبہ میں
کہاں کہاں ترا شیدا تجھے پکار آیا

سر اپنا کاٹ کے پھینک آیا کوئے قاتل میں
یہ بوجھ تھا مری گردن پہ سو اُتار آیا

جوان معرکۂ حسن و عشق تھا آزاد
چلا نہ دل پہ جو قابو تو جان ہار آیا

غزل

مرے سینے میں تری آہوں کے پیکاں رہ گئے
کچھ تو آہوں میں گئے کچھ ہو کے پیکاں رہ گئے

صبح کس رفتار سے آئے تھے تم گلزار سے
جس روش پر تھے وہیں سرو خراماں رہ گئے

اپنے رتبے کو گھٹا کر بھی پھرے اہلِ کمال
پھر بھی کچھ قیمت نہ پائی ہو کے ارزاں رہ گئے

حسن لب سے ہے تبسم کہہ رہا دیکھو ادھر
ہو گئے روپوش موتی لعل و مرجاں رہ گئے

شمع رو سب دیکھتے تھے حسن کے شعلہ کو رات
ہم نے آئینہ دکھایا جب تو حیراں رہ گئے

غزل

سبزۂ خط کے شوق میں دل نہیں اپنے حال پر
طائر دل وہ اُڑ رہا ہے ورق الخیال پر

مصحفِ روئے یار میں مو ہے دیکھا خال پر
لکھتے ہیں قل ہو اللہ ہم خطِ مہ جبیں کی دال پر

نامہ شوق کو مرے باندھے اگر تو بال پر
کیوں ہوئے مرغ نامہ بر تجکو ترے وبال پر

شوق تو دل کا اے پری دیکھ کہ گل کے کان میں
بیٹھا فسانہ کہتا ہے گلبن نونہال پر

صیدِ فگن کدھر کو ہے دیکھ تو آکے مرغ دل
لیٹے ہوئے قفس کو ہیں لوٹ رہے ہیں جال پر

دشتِ جنوں میں قیس کو خاک بھی دے نہ پیرہن
منتِ قاصدِ صبا لیتا ہے بال بال پر

چھوڑ دے خط کو ہاتھ سے ذوق تو پہنچ رہیگا یہ
اس کو صبا اُڑائیگی ہونگے ترے خیال پر

غزل

جدھر کو ہم ہوئے آخر اُدھر کو تم نہ ہوئے
ہم اپنے دل میں رہے ہائے کاش گم نہ ہوئے

جو اہل علم تھے آئے حجاب اکبر ہیں	بھلے کو حضرتِ دل دام ظلکم نہ ہوئے
اٹھایا بار کتب خوب شیخ صاحب نے	پر اک تو دُم نہ ہوئی ایک یہ کہ سُم نہ ہوئے
تمہاری جنبش لب کر گئی مسیحائی	ہزار شکر کہ ہم شرمسار قُم نہ ہوئے
جہاں تھا معرکۂ عشق شیخ بھاگے وہاں	پھر آکے سامنے کہنا کہ نوک دُم نہ ہوئے

ولہ

رات سونے کے لئے تھی اب ہے رونے کے لئے	دن رہا باقی سو ہے وہ جان کھونے کیلئے
ناخدائی کی وہیں موجِ تبسم نے تری	گریہ جب آیا مری کشتی ڈبونے کے لئے
چشم کے چشموں پہ میرے مردمِ دیدہ نہیں	پُتلیاں بیٹھی ہیں دو موتی پرونے کے لئے
ذوق جو کشتِ امل تھی ہوگئی سرسبزیاں	اب ہے کیا باقی جو پھر آئینگے بونے کے لئے

خطاب بہ قلم

آ قلم آکہ سرنامہ لکھوں نامِ خدا	جو کہ لے نام خدا اُس پہ ہے انعامِ خدا
تو جوانی میں مری تیغ شرربار رہا	کرتا اعدائے بداندیش کو فی النار رہا
پر اب ایام ضعیفی نظر آتے ہیں قریب	فضل اپنے سے جو اللہ کرے عمر نصیب
اے مرے دوست نہ تو مجھ سے جدا ہو جانا	اپنے آزاد کی پیری کا عصا ہو جانا

اشعار متفرق

دیکھتا ہے دمبدم گردش کو کیا افلاک کی	پیکر خاکی کو دیکھ اپنی گھڑی ہے خاک کی
تیر جو آیا سو اُترا خاک تودہ پہ مرے	تھی چڑھی کس ہاتھ سے یارب کماں افلاک کی

ولہ

سنیگا دیکھنا رو رو کے آواز اک جہاں میری — تمہارے عشق کی ہے داستاں اور ہے زباں میری

سناؤں داستان عشق سب قلقل کے پردہ میں — صراحی کے دہن پر کاٹ کر رکھدو زباں میری

تقاضا ہے گریباں کا کہ مجکو چاک کر ڈالو — تمنّا ہے یہ دامن کی اُڑا دو دھجّیاں میری

ولہ

کس نظر سے تھا رکھا ظالم نے پیکاں تیر میں — بوند ہوکر آہ اُترا ہے دل دلگیر میں

ولہ

غنچہ چمن میں بزم میں تصویر بول اُٹھے — مُنہ سے اگر وہ عالم تصویر بول اُٹھے

ولہ

میں وہ نہیں ہوں کہ ہوں تجھ میں اور تو ہو کہیں — وہ گل کھلوں کہ ہوں گلبن پہ اور بو ہو کہیں

ولہ

ہوا لیلی پہ مجنوں کوہکن شیریں پہ سودائی — محبت دل کا اک سودا ہے جسکی جس سے بن آئی

ولہ

ہمارے دل میں تمہیں ہو تمہیں ہماری قسم — مگر یقین ہے کب آئی تمہیں ہماری قسم

ولہ

وہ تو جس بات میں دیکھو ہمیں دم دیتے ہیں — اور ہمیں دیکھو کہ ہم اس پہ بھی دم دیتے ہیں

ولہ

دل ہے دیوانہ تو پڑھنا مرا دیواں چاہیئے — سیر مضموں ہے اگر سیر پرستاں چاہیئے